راہِ جنوں
نگہت سیما

راہ جنون

اس شام پوری وادی گھنے بادلوں کی لپیٹ میں تھی اور پوری وادی میں جیسے وہ شام بہت اداس تھی اور سید ثقلین شاہ گیلانی اس شام حضرت بل سے موئے مبارک کی زیارت کر کے کپواڑہ پہنچے تھے حالانکہ آقا جان نے انہیں منع بھی کیا تھا اور اماں جان نے بھی مگر معلوم نہیں کیوں دل کو عجیب سی بے چینی لاحق ہو گئی تھی حالانکہ جب وہ سری نگر آئے تھے تو ان کا ارادہ تھا کہ وہ آٹھ ماہ بعد گھر جا رہے ہیں تو کم از کم ایک ہفتہ وہاں رکیں گے ضرور انہیں اماں جان کی بیماری کا بھی خیال تھا اور [illegible] بار ... کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اور جب گھر میں پوتے پوتیوں کی چہکار سے بڑھاپا بہلتا ہے وہ تنہا گھر میں جنگلوں اور پہاڑوں وادیوں اور میدانوں میں آزادی کی جنگ لڑنے والے بیٹوں کی راہ تکتے تھے۔

اس رات عابد قیصرانی کے ساتھ کپواڑہ جاتے جاتے اچانک ہی وہ سری نگر جانے کا پروگرام بنا بیٹھے تھے اور سیدھے حضرت بل کی درگاہ پہنچے تھے۔ حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کے اس روحانی مرکز سے انہیں خاص عقیدت تھی اور کتنے ہی ماہ گزر گئے تھے وہ ادھر نہ آسکے تھے اور وہاں سے وہ سیدھے گھر آئے تھے اور آقا جان جو برآمدے میں بچھے لکڑی کے تخت پر بیٹھے قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر یکدم کھڑے ہو گئے تھے اور بجائے گلے ملنے کے انہوں نے تیزی سے بڑھ کر ڈیوڑھی کا دروازہ بند کیا تھا اور پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً انہیں کھینچتے ہوئے پچھلے کمرے میں لے گئے تھے اور پھر جیسے ضبط کے بند ٹوٹ گئے تھے اور بے اختیار دونوں بازو پھیلائے انہوں نے سید ثقلین شاہ کو دیکھا تھا اور سید ثقلین شاہ ان کے سینے سے یوں آ لگے تھے جیسے برسوں کے بچھڑے آن ملے ہوں اور پھر بہت دیر بعد انہیں خود سے الگ کرتے ہوئے آقا

جان نے کانپتے ہاتھوں میں ان کا چہرہ تھام لیا تھا اور ان کی روشن پیشانی کو متعدد بار چوما تھا۔ آنکھیں تھیں کہ ان کی پیاس بجھتی ہی نہ تھی۔ تب سید ثقلین شاہ نے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر انہیں بٹھاتے ہوئے نرمی سے پوچھا تھا۔

"اماں جان کہاں ہیں؟"

"پچھلے کمرے میں دو راتوں کی بے خوابی کے بعد سوئی ہیں۔"

"کیا طبیعت کچھ خراب تھی؟" سید ثقلین ماں کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہاں۔ دو راتوں سے مسلسل پولیس چھاپا مار رہی ہے۔ تمہاری اور سبطین کی تلاش میں۔ کل پوری رات گلی میں بیٹھے گزری ہے۔ پورے محلے کو گھروں سے باہر نکال کر تلاشی لی گئی ہے۔ حسنین کو بھی پکڑ کر لے گئے تھے مگر پھر چھوڑ دیا۔"

"کہاں ہے وہ؟" سید ثقلین نے تڑپ کر پوچھا۔

"حکیم ابو اسحاق ساتھ لے گئے تھے چوٹوں پر مرہم لگانے کے لیے آتا ہی ہوگا۔"

سید ثقلین نے بے بسی سے ہونٹ کاٹے ان کے لیے یہ اندازہ کرنا ہرگز مشکل نہ تھا کہ حسنین کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہوگا۔ انہیں اپنے اس چھوٹے بھائی سے [illegible] تھا۔ وہ چھوٹا سا تھا تو اماں جان بیمار پڑ گئی تھیں اور وہ اور سبطین اسے سنبھالا کرتے تھے اور اکثر اسے کندھوں پر بٹھا کر پوری گلی کا چکر لگا آتے تھے کہ اسے کندھوں پر بیٹھنا بہت پسند تھا۔ بھلا وہ تیرہ چودہ سالہ لڑکا کہاں پولیس کی مار کی تاب لا سکا ہوگا۔

"وہ...... وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"وہ بھی تمہارا ہی بھائی ہے ثقلین شاہ!" آقا جان مسکرائے تھے۔ "بہت بہادر اور باہمت۔"

ان کی باتوں کی آواز سن کر ساتھ والے کمرے سے اماں جان اٹھ کر آ گئی تھیں اور پھر آٹھ ماہ بعد سید ثقلین نے اپنے بازو ان کے گرد حمائل کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھ دیے تھے اور کچھ دیر بعد جب حسنین واپس آیا تھا تو ایک لمحے کو تو وہ اسے دیکھ کر ساکت رہ گئے تھے۔ اس کے پورے چہرے پر نیل پڑے تھے۔ بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"بھائی!" ہاتھ میں پکڑا ہوا شاپر جس میں شاید دوائیاں تھیں ...... حسنین کے ہاتھوں سے گر پڑا اور وہ دوڑ کر ان سے لپٹ پڑا تھا۔

"بھائی! پچھلی بار آپ نے کہا تھا تحریک آزادی میں حصہ لینے کے لیے میں ابھی چھوٹا ہوں لیکن اب تو۔" اس نے اپنے جسم کے زخموں کو فخر سے دیکھا۔

"مجھے ساتھ لے چلیں گے نا۔"

"ہاں اب تو...... لیکن میری جان! تمہاری یہاں بھی ضرورت ہے...... آقا جان اور اماں جان کو پھر تم یہاں رہ کر بھی بہت کچھ کر سکتے ہو۔ میں بہت جلد تمہیں لائحہ عمل بتا دوں گا۔"

اور اس رات دونوں بھائی دیر تک گھر کے آخری کمرے میں جس کا ایک دروازہ باہر ایک تنگ گلی میں کھلتا تھا، لیٹے سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے تھے۔ اس دروازے کے آگے بڑا سا صندوق تھا جس میں بستر پڑے رہتے تھے لیکن جس کے نیچے پہیے لگے تھے۔ بوقت ضرورت اس صندوق کو دھکیل کر دروازے سے ہٹایا جا سکتا تھا۔ دروازے کی اونچائی اتنی ہی تھی کہ دروازہ صندوق کے پیچھے چھپ جاتا تھا اور بظاہر کمرے میں داخل ہو کر پتا نہیں چلتا تھا کہ صندوق کے پیچھے کمرہ ہے۔ ہاں گلی میں جا کر ہی پتا چل سکتا تھا اور باہر آقا جان نے تخت پر لیٹے ساری رات تقریباً جاگتے ہی گزار دی تھی۔ گلی میں ذرا سی آہٹ ہوتی تو وہ اٹھ کر بیٹھ جاتے اور چوکنے ہو جاتے اور وہ چند دن گھر پر رہ کر آقا جان اور اماں جان کو اپنی قربت اور موجودگی سے سکون بہم پہنچانا چاہتے تھے۔ انہوں نے پریشان ہو کر سوچا، ان کا یہاں رہنا تو آقا جان اور اماں جان کے لیے اور بھی آزمائش ہے۔"

صبح سبز کشمیری چائے پیتے ہوئے انہوں نے آقا جان کے فکر مند چہرے کو دیکھا اور پشیمان سے ہو گئے۔ "آقا جان! آپ رات بھر سو نہیں سکے۔"

"ہاں۔" انہوں نے اقرار کر لیا۔ "تمہاری وجہ سے پریشانی رہی کہ کہیں کسی نے تمہیں آتے دیکھ کر مخبری نہ کر دی ہو۔" اور یہ محض اتفاق تھا کہ کسی نے انہیں دیکھا نہ تھا یا پھر اگر دیکھا بھی تو پہچانا نہیں ہوگا۔ ایک تو انہوں نے داڑھی رکھ لی تھی۔ دوسرے اس مشقت اور جدوجہد بھری زندگی نے ان کی رنگت سانولی بنا دی تھی۔

"کیا یہاں بھی کالی بھیڑیں ہیں؟"

"ہاں لیکن ابھی تک پتا نہیں چل رہا کہ کون مجاہدین کی مخبری کرتا ہے۔"

"بھائی! لوگوں کو عبدل پر شک ہے کہ وہ ملوث ہے۔"

"عبدل قصائی!" انہوں نے تصدیق کی اور پھر واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو اماں جان بول اٹھیں۔

"تم تو ایک ہفتہ رہنے کے لیے کہہ رہے تھے؟"

"ہاں لیکن آپ کو پریشانی ہوگی۔ رات بھی آقا جان سو نہیں سکے۔"

"ارے نہیں سید ثقلین شاہ۔" آقا جان نے نگاہوں ہی نگاہوں میں تو جوانی میں ہی ان کی پیشانی پر دمکتے سجدوں کے نشان کو چوما۔ "اگر کسی نے مخبری کرنا ہوتی تو رات ہی چھاپا پڑ جاتا سو کچھ دن رہ کر ماں کی آنکھیں ٹھنڈی کر دو۔ کیا خبر اگلی بار تم آؤ تو ہم نہ ہوں یا......"

لیکن پتا نہیں کیا ہوا تھا کہ شام ہوتے ہی وہ از حد بے چین ہو گئے تھے اور اپنی بے چینی کو وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے تب رات کا اندھیرا ہوتے ہی وہ پچھلی گلی سے حکیم ابو اسحاق کے ساتھ جا کر وہاں سے ایک مریض کے ساتھ ضیا ڈار گاڑی پر بیٹھ کر لال چوک تک آئے تھے اور وہاں سے واپس جانے والے زائرین کی ایک بس پر بیٹھ گئے تھے۔ راستے میں انہوں نے فوجی گاڑیوں اور ٹرکوں کو حضرت بل کی درگاہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر دعا کی تھی۔

"یارب العالمین حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کے اس روحانی مرکز کو ان ظالم فوجیوں سے محفوظ رکھنا اور پھر کہیں رستے میں قیام کرتے کہیں پیدل چلتے جب وہ کپواڑہ پہنچے تھے تو وادی کو سیاہ بادلوں نے گھیر رکھا تھا۔

خفیہ راستوں سے ہوتے ہوئے جب وہ کیموفلاج [illegible] کی قیام گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے تو انہوں نے بے چین اور حیران ہو کر سوچا تھا کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں جب کہ سری نگر جاتے ہوئے عابد قیصرانی سے یہ بات طے پا گئی تھی کہ سری نگر چند دن قیام کرنے کے بعد وہ سیدھے سفارہ پور جائیں گے اور عابد بھی ان سے وہاں ہی ملیں گے پھر یہ کون سی طاقت تھی جو انہیں کشاں کشاں یہاں لے آئی تھی۔

کیا عابد کو خدا حافظ کہتے ہوئے انہیں سیدہ زارا گیلانی سے نہ ملنے کا رنج تھا کہ ایک بار پھر وہ یہاں آ گئے تھے جب وہ عابد کے ساتھ کپواڑہ آئے تھے تو شاید دل کے اندر کہیں زارا کو بھی دیکھنے کی خواہش موجود تھی جب ہی تو عابد قیصرانی کی والدہ کے ہاتھ سے نمکین کشمیری چائے کا کپ لیتے ہوئے وہ بے اختیار زارا کے متعلق پوچھ بیٹھے تھے اور پھر خود ہی پشیمان ہو کر سر جھکا لیا تھا۔

سیدہ زارا بارہ مولہ میں اپنی پھوپھی کی طرف گئی ہے۔

اور اداسی قطرہ قطرہ کر کے ان کے دل پر گرنے لگی تھی اور انہیں سات سال پہلی کی وہ اندھیری رات یاد آ گئی تھی جب پہلی بار وہ زخمی ہو کر عابد قیصرانی کے دروازے پر بے ہوش ہو کر گر گئے تھے اور گرنے سے پہلے انہوں نے اندر سے آتی کسی خاتون کو دیکھا تھا جس کا چہرہ سیاہ نقاب

میں چھپا تھا تو دل کو اطمینان سا ہوا تھا کہ یہ کسی مسلمان کا ہی گھر ہے اور پھر جب ان کی آنکھ کھلی تو ایک مہربان چہرے والی خاتون ان پر جھکی ہوئی تھیں اور ان کی پیشانی پر جم جانے والے خون کو نیم گرم پانی میں روئی بھگو کر پونچھ رہی تھیں۔

خاتون کے چہرے پر ماں کا نور تھا۔ آنکھوں میں ماں کی شفقت اور محبت تھی اور کمرے کے کونے میں کھڑی ایک دلکش سی لڑکی جس کی بڑی بڑی آنکھیں خواب ناک سی تھیں اور جس کے تراشیدہ لبوں کی رنگت یاقوت کی طرح تھی اور جس کے کھڑے ہونے کے انداز میں انوکھا سا وقار تھا اور جو مخصوص کشمیری لباس جسے فرن کہتے ہیں پہنے ہوئے تھی اور اس نے سر کے بالوں کو رومال سے ڈھک رکھا تھا اور کندھوں پر سیاہ کشمیری شال ڈالے ہوئے تیز تیز بول رہی تھی۔ وہ جس سے بحث کر رہی تھی وہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کی آواز سید ثقلین کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔

"دیکھو زارا تم مجھ سے بحث نہ کرو۔ تمہارے اور میرے خیال کبھی نہیں مل سکتے۔ مجھے امن اور سکون سے محبت ہے۔ مجھے بارود سے نفرت ہے۔ خون دیکھ کر مجھے قے ہو جاتی ہے۔ زارا آزادی حاصل کرنے کا یہ طریقہ مجھے پسند نہیں ہے۔ مجھے اس وادی سے محبت ہے مجھے جھیل ڈل میں تیرتے [illegible] لگتے ہیں۔

چیڑ اور کاؤ کے جنگلات چناروں کے پیڑ پہاڑوں سے پھوٹتے قدرتی چشمے۔ یہ سب...... یہ سب مجھے FASINTATE کرتے ہیں۔ زارا...... انہوں نے میرے اندر کہیں چھپے ہوئے نازک احساس رکھنے والے شاعر کو بیدار کر دیا ہے اور شاعر ہاتھ میں اسلحہ نہیں پکڑ سکتا اور تب ہی انہوں نے ذرا سا سر اٹھا کر اسے دیکھنے کی کوشش کی تھی اور سوچا تھا...... "شاید میں غلط جگہ آ گیا ہوں۔" اور تب ہی وہ یکدم ان کی طرف مڑی تھی۔

"آپ پلیز لیٹے رہیں آپ زخمی ہیں۔ آپ ہی غالباً وہ مجاہد ہیں جنہوں نے ان کے اسلحے کے ڈپو کو تباہ کیا ہے۔ آپ کے دو ساتھی شہید ہو گئے ہیں۔ یکدم وہ اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور انہوں نے اس نوجوان کو دیکھا جو بیزار سا کرسی پر بیٹھا اور اس کے سامنے Writing Table پڑی ہوئی تھی...... "انجانے میں شاید وہ اس گھر میں آ گئے تھے جہاں آزادی کی اس تحریک کو ان کا طریقہ کار پسند نہیں کیا جا رہا تھا۔ کچھ گھرانے تھے ایسے جو جہاد اور قتل و خون سے خوف زدہ تھے اور نہیں جانتے تھے کہ اب کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ یہاں ان کے لیے خطرہ ہو سکتا تھا لیکن سیدہ زارا نے شاید ان کے خیالات پڑھ لیے تھے اور اس کے یاقوتی لبوں پر بڑی مہربان سی

مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی تھی۔

''آپ بے فکر رہیں' یہاں اس گھر میں آپ کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آپ پر کوئی آنچ آنے سے پہلے ہم سب...... میری والدہ' والد اور میں آپ پر قربان ہو جائیں گے۔ آپ کے اور دشمن کے درمیان اپنے وجود کی دیوار تان دیں گے حتیٰ کہ میرا یہ نازک دل بھائی بھی' جس کی گفتگو سن کر آپ پریشان ہو گئے ہیں...... ہم اپنے مجاہدین کے جوتوں کی ایڑیوں سے اٹھنے والی خاک سے اپنی مانگ کی افشاں چنتے ہیں اور میرا یہ بھائی' یہ شاعر بھائی اسے میری ماں نے پیدا ہوتے ہی بے اولاد ماموں کی گود میں ڈال دیا تھا اور جو تین ماہ پہلے تک لندن میں ماموں کے پاس مقیم تھا۔ جس نے اپنی تعلیم' اپنا بچپن اور لڑکپن وہاں ہی گزار دیے۔ جس نے جھیل ڈل اور اس کے پانیوں میں تیرتے بجروں اور کشتیوں کی خوبصورتیوں کے صرف قصے سنے ہیں' کبھی انہیں خون میں نہاتے نہیں دیکھا' جسے وادی کی خوبصورتی نے قید کر لیا ہے' جسے چشموں کے [illegible] میں آسمانی نغمے سنائی دیتے ہیں' جسے پہاڑوں کا حسن اسیر کرتا ہے اور جو زعفران کے پھولوں کو حیرت سے دیکھتا ہے اور ان پھولوں کو چننے والیوں کی معصومیت کو سراہتا ہے لیکن اسے ان کی آنکھوں میں وحشت دکھائی نہیں دیتی ابھی اس کے کانوں میں ماتمی بین اور چیخوں کی آوازیں نہیں پڑیں۔ ابھی اس نے لہو کو ارزاں سے بہتے نہیں دیکھا...... جب یہ سب کچھ دیکھ [illegible] میرے ماموں نے اسے...... اس اکلوتے بیٹے کو پال پوس کر اس وادی کے لیے واپس بھیجا ہے...... ماموں نے لکھا تھا' ''آپا میں اپنا بیٹا اس وادی کے حوالے کر رہا ہوں کہ وہ بھی اس گروہ میں شامل ہو جائے جو آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔''

''زارا تم تقریر اچھی کر لیتی ہو لیکن مجھے جنگ سے نفرت ہے۔'' لڑکے کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہو گیا تھا۔

''یہ جنگ نہیں ہے میرے بھائی' یہ تو جہاد ہے۔ اپنا دفاع ہے' یہ تو خود کو بچانے کی سعی ہے غلامی کی ذلت سے بچنے کی۔'' اور سید ثقلین حیران سا سیدہ زارا کو بولتے دیکھ رہا تھا اور پھر جب وہ وہاں سے روانہ ہوا تو اسے یوں لگا تھا' جیسے وہ اپنے دل میں اس خوبرو لڑکی کی محبت کا درد چھپائے جا رہا ہے۔

دس روز کے اس قیام میں جب اس کے زخموں میں پیپ پڑ گئی تھی اور تیز بخار نے اسے اٹھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا' سیدہ زارا نے اسے ہر ہر طرح سے متاثر کیا تھا اور سید عابد قیصرانی جو اپنے نام کے ساتھ قیصرانی تخلص لگاتا تھا جو لندن میں اس کے ایک استاد حامد قیصرانی

کے نام کا حصہ تھا۔ جو اس کے اشعار کی تصحیح کرتے تھے اور جن کے ساتھ وہ بہت اٹیچڈ تھا اور جن سے اس نے مذہبی تعلیم بھی حاصل کی تھی اور چند سال قبل وفات پا گئے تھے۔

یہ سید عابد شاہ قیصرانی بھی اسے اچھا لگا تھا۔ محبتوں کا داعی' امن کا پیامبر' جو محبتوں کی نظمیں لکھتا تھا جو ان کے ساتھ نظریاتی اختلاف رکھتا تھا لیکن جس نے سیدہ زارا اور اپنی والدہ کے ساتھ مل کر ان کی تیمارداری کی تھی اور انہیں اپنی خوبصورت نظمیں سنائی تھیں اور جس روز وہ رخصت ہو رہے تھے تو ان کا دل بے تحاشا محبت کرنے والے لوگوں کی جدائی کے خیال سے بوجھل ہو رہا تھا اور میز کے کونے سے ٹیک لگائے کھڑے جب انہوں نے سیدہ زارا کی تیمارداری کا شکریہ ادا کیا تھا تو ان کی نظر اچانک ہی ٹیبل پر پڑے ایک کلپ بورڈ پر پڑی تھی...... سید عابد شاہ شاید کچھ لکھتے لکھتے اٹھا تھا اور زارا نے بھی کلپ بورڈ پر لگے ہوئے کاغذ کی تحریر پڑھی تھی اور پھر نہ جانے کس خیال سے وہ کاغذ کلپ بورڈ سے نکال کر انہیں دے دیا تھا اور ابھی وہ کاغذ کی تحریر پڑھ نہ سکے تھے کہ سید عابد قیصرانی اس کمرے میں کونے کے کر آ گیا جس نے مجاہدین کے قریب ترین ہائیڈ آؤٹ تک ان کی راہنمائی کرنا تھی' تب انہوں نے کاغذ کو مٹھی میں دباتے ہوئے سید عابد شاہ کو کہا تھا۔

''عابد قیصرانی' تمہارا قلم بہت خوبصورت ہے اور تمہارے پاس لفظوں کا بے بہا خزانہ ہے [illegible] اپنے قلم سے لوگوں کے ضمیر کو جگاؤ۔ انہیں متوجہ کرو' انہیں بتاؤ کہ ظلم حد سے بڑھ گیا ہے۔''

اور عابد قیصرانی کو سوچ میں ڈوبے چھوڑ کر وہ ماں کی دعائیں اور زارا کی آنکھوں کی نمی ساتھ لے کر جب ایک محفوظ جگہ پہنچے تھے تو انہوں نے زارا کا دیا ہوا وہ کاغذ کھولا تھا۔ یہ عابد کی لکھی ہوئی نامکمل نظم تھی۔

سورج سرمگیں پہاڑوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا
اور چناروں میں آگ لگی تھی
اور زعفران کے کھیتوں میں
وہ خود بھی زعفران کا ایک پھول
لگ رہی تھی۔
یوں لگتا تھا جیسے
اس نے زعفران کے پھولوں سے جنم لیا ہو۔
اس کے رخساروں کو گلابوں نے دھویا ہو۔

اور آبشاروں نے دودھ پلایا ہو۔
ڈوبتے سورج کا سارا سونا
اس کے وجود سے لپٹ رہا تھا
وہ اس حسین وادی کی بیٹی تھی
وہ سونے سے بنی تھی۔
میں نے اسے ہر روز
زعفران کے کھیتوں میں دیکھا
اور ہر روز اسے اپنے دل میں پہلے سے زیادہ محسوس کیا۔
اور جب میں اس وادی سے رخصت ہوا
تو اس نے مجھے چنار کا پتا دیا
اور آج اتنے سالوں بعد بھی وہ میرے دل میں ہے

نظم پتا نہیں ادھوری تھی یا مکمل تھی۔ اسے عابد نے انگریزی میں لکھا تھا...... وہ انگلش میں ہی زیادہ لکھتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں انہیں یوں لگا جیسے زارا نے انہیں بھی چنار کا پتا دیا ہے۔ یہ نظم نہیں تھی' یہ دراصل چنار کا پتا تھا۔ جو زارا نے انہیں اس [illegible] تھا کہ انہیں [illegible] جائے کہ وہ یہاں سے اکیلے نہیں جا رہے' ان کے ساتھ سیدہ زارا کی محبت بھی ہے۔

اور پھر ایک سال بعد سید عابد شاہ قیصرانی بھی ان سے آ ملا تھا...... اس کے ہاتھ میں قلم نہیں چھوٹی سی آٹو میٹک رائفل تھی......

''آپ نے کہا تھا' قلم سے سوئے ضمیروں کو جگاؤں'' لیکن شاید میرے قلم میں اتنی طاقت نہیں ہے یا لوگوں کے ضمیر اندھے' گونگے اور بہرے ہو گئے ہیں اس لیے میں نے بندوق اٹھائی ہے۔''

وہ عابد قیصرانی جس کے نقوش میں عجیب سی ملاحت اور نزاکت تھی...... جس کے ہاتھ لانبے پتلے اور نرم تھے اور ہتھیلیاں بہت ملائم لڑکیوں کی طرح تھیں' اس نے اپنے نرم ہاتھوں میں بندوق تھام لی تھی...... اور اس طرح چھ سال سے وہ سید ثقلین کے ساتھ تھا۔

یہاں آنے سے پہلے اس کے ایک بھائی سید مطلوب حسین شاہ شہادت پا چکے تھے۔ ان چھ سالوں میں چند بار وہ اس کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ اس کی قیام گاہ پر اور ان کی سیدہ زارا سے ملاقات ہوئی تھی اور انہیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جو قندیلیں جل اٹھی تھیں' انہوں نے سید

ثقلین کو بتایا تھا کہ وہ نظم نہیں تھی — چنار کا پتا تھا جو زارا نے انہیں دیا تھا — اور ابھی ایک سال قبل ہی تو زارا نے ان سے التجا کی تھی کہ وہ اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیں۔ وہ تحریک آزادی میں ہر قدم ان کے ساتھ چلنا چاہتی ہے۔

''مگر زارا! بہت ہی بے اعتبار زندگی ہے یہ۔ کیا پتا ابھی باہر نکلوں اور جام شہادت نوش کر لوں۔''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سید ثقلین شاہ......'' زارا نے اپنی بے حد خوبصورت خوابناک آنکھیں اوپر اٹھائی تھیں اور پھر جیسے وقت ایک لمحے کو وہیں ٹھہر گیا تھا اور وہ ایک لمحے کو سب کچھ بھول بیٹھے تھے۔ انہیں صرف یہ یاد رہ گیا تھا کہ یہ بے حد دلچسپ اور دلربا لڑکی جس کے یاقوتی لبوں کی تراش ان کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دیتی ہے' ان کے دل کی اولین ترین خواہش ہے۔ اس کی رفاقت اور ہمراہی زندگی کا حسن ہے۔

''سیدہ زارا شاہ!'' وہ بولے تو ان کی آواز جذبات سے بوجھل ہو رہی تھی۔ ''ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہماری زندگی میں آنے والی پہلی خاتون آپ ہی ہیں — آزادیٔ کشمیر کے علاوہ ہم نے اگر کوئی دوسری بات سوچی ہے تو وہ آپ کے حوالے سے ہے۔ ہم نے اگر کوئی خواب [illegible] آزادی کے علاوہ تو وہ آپ کی رفاقت کا خواب ہے لیکن سیدہ زارا شاہ......''

اور وہ اپنی بات مکمل بھی نہ کر پائے تھے کہ عابد شاہ گیلانی نے انہیں بھارتی گوریلا فوج کے اس دستے کے متعلق بتایا جو ادھر ہی آ رہا تھا اور جس کے متعلق ابھی کچھ دیر پہلے ایک مخبر نے خبر دی تھی اور تب وہ بات مکمل کیے بغیر ہی عابد شاہ کے ساتھ گھر سے نکل گئے اور شاید ایک سال بعد عابد قیصرانی کے ساتھ وہی ادھوری بات مکمل کرنے چلے آئے تھے لیکن جب ماں جی نے بتایا کہ وہ تو پھوپھی کی طرف گئی ہے تو ہاتھ میں پکڑا تازہ اور خستہ باقر خانی کا ٹکڑا انہوں نے واپس رکھ دیا اور ایک ہی گھونٹ میں چائے حلق سے اتارتے ہوئے انہوں نے سوچا تھا۔

''سیدہ زارا شاہ شاید آج کے بعد کبھی ملاقات نہ ہو۔ شاید آج کے بعد میں کبھی نہ آ سکوں۔'' بہت دنوں سے انہیں ایسا لگتا تھا جیسے آسمان سے الوہی خوشبوئیں آتی ہیں اور انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ کئی بار انہوں نے خواب دیکھا تھا کہ وہ آسمانوں کی طرف محوِ سفر ہیں اور ان کے اردگرد خوشبوئیں ان کے جسم و جاں کو معطر کیے جاتی ہیں۔

وہ سیدہ زارا کو بتانا چاہتے تھے کہ وہ سید ثقلین شاہ اس سے کتنی اور کس قدر شدید محبت کرتے ہیں اور اس نے کس کس طرح انہیں متاثر کیا ہے — اور شاید یہی کچھ احساس تھا جو ایک

بار پھر انہیں سید عابد قیصرانی کی طرف لے جا رہا تھا لیکن یہ تو ان کے پروگرام میں بالکل ہی شامل نہ تھا پھر وہ از حد حیرانی سے اس مخصوص راستے کے اختتام پر ایک لمحے کو رک گئے جہاں سے وہ اور سید عابد اکثر آیا کرتے تھے۔ دو پہاڑوں کے درمیان اس طرح راستہ بنا ہوا تھا کہ اوپر ایک مستطیل چٹان تھی اور راستے کے اردگرد جنگلی پودوں اور درختوں سے ڈھکا ٹیلا تھا اور نیچے بہت گہرائی میں پگڈنڈی سی بنی ہوئی تھی اور ہوا کے سنگ اڑتی ہوئی یہ آوازیں۔

یہ تو رونے کی آوازیں تھیں۔ یہ تو بین تھے چیخیں تھیں۔ کیا..... کیا ہوا تھا یہاں۔ انہوں نے خود کو کسوفلاج کر کے کان آوازوں پر لگا دیے تھے۔ ہوا کا رخ اس سمت ہوتا تو آوازیں ذرا دیر کو واضح ہوتیں اور پھر مدھم ہوتے ہوتے گم ہو جاتیں۔ شاید بھارتی درندوں نے یہ تباہی مچائی ہے

شاید.....اور پھر بھاری دل اور خون ہوتی آنکھوں کے ساتھ وہ گاؤں کی سمت چلتے رہے اور ابھی وہ چند گز دوری تھے کہ رشید بٹ اچانک ہی ان کے سامنے آ گیا تھا۔

مجاہد رشید بٹ سے وہ واقف تھے اور کئی بار وہ اکٹھے بھی کسی مشن پر روانہ ہوئے تھے۔ وہ ہائیڈ آؤٹ کی طرف جا رہا تھا۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون۔'' ان کے لب ہلے۔

ان کا اور سید عابد شاہ کا چھ برس کا ساتھ تھا۔ ان چھ برسوں میں وہ بہت کم الگ ہوئے تھے بلکہ مجاہدین میں تو وہ دونوں الگ الگ تھے ہی نہیں..... ایک انہیں اکٹھا ہی پکارا جاتا تھا کمانڈر سید ثقلین عابد..... کیسی کیسی خطرناک مہمات پر وہ اکٹھے رہے تھے۔ تو یہی بے چینی تھی' یہی اضطراب تھا جس نے انہیں سری نگر میں ٹکنے نہیں دیا تھا حالانکہ وہ آٹھ ماہ بعد گھر گئے تھے۔ دل کے تار تو سید عابد شاہ گیلانی سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کا دل جیسے کٹنے لگا۔

رات اچانک ہی بھارتی بلیک کیٹ گاؤں میں گھس آئے۔ انہیں کمانڈر مرتضیٰ کی تلاش تھی جو پچھلے چند ماہ سے ان کو بے حد نقصان پہنچا رہے تھے لیکن مرتضیٰ ان کے آنے سے پہلے ہی گاؤں چھوڑ چکے تھے۔ یہ کپواڑہ کے قریب ہی ذرا بلندی پر گاؤں تھا۔ سید عابد شاہ جنگل کی طرف سے آ رہے تھے کہ بلیک کیٹ کے ایک مخبر نے انہیں پہچان لیا..... اور چلایا کہ یہ تو سید ثقلین شاہ کا سایہ' کمانڈر عابد قیصرانی ہے۔'' اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے یا اپنا دفاع کرتے اس نے ہاتھ میں پکڑی کلاشنکوف کا فائر ان پر کھول دیا۔

مجاہد رشید بٹ نے انہیں تفصیل بتائی۔'' گاؤں میں چھاپے کے دوران بھی ایک شخص

شہید ہوا ہے۔ دونوں جنازے تیار پڑے ہوئے ہیں میں ذرا ہائیڈ ہاؤس تک جا رہا تھا' یہ دیکھنے کہ سید زوار شاہ اگر وہاں ہوں تو بھائی کے جنازے میں شریک ہو سکیں۔ رات تو وہاں ہی تھے۔'' اور سید ثقلین حیدر کو یوں لگا تھا' جیسے ان کا دل کٹ کٹ کر گر رہا ہو۔

سید عابد شاہ قیصرانی شہید ہو گیا تھا جو ایک حساس دل رکھتا تھا۔ جسے جھیل ڈل کے پانیوں میں تیرتے سجے بجرے گیت لکھنے پر اکساتے تھے' جسے زعفران چنتی لڑکیاں بھاتی تھیں۔ جسے پہاڑوں سے بہہ کر آنے والے چشمے گیت سناتے تھے۔ جس کے ہاتھ فنکاروں کی طرح تھے اور جس نے آزادیٔ کشمیر کی خاطر ان گیتوں کو سنبھال کر رکھ دیا تھا اور قلم کی جگہ بھاری گن اٹھالی تھی لیکن کبھی کبھی جنگلوں میں سفر کرتے کرتے وہ چلتے چلتے رک جاتا اور گھاس میں اگ آنے والے کاسنی اور گلابی پھولوں کو حیرت سے دیکھتا' بیٹھ کر انہیں اپنے نرم ہاتھوں سے چھوتا۔ سرخ بیل بوٹیوں کو ننھے بچوں کی طرح ہاتھوں میں لے لیتا اور ثقلین شاہ کی طرف دیکھتا۔ ایسے میں اس کی آنکھوں میں کسی ایسے ننھے بچے کی سی چمک ہوتی تھی جو عجائبات دیکھ رہا ہو۔

''یہ پھول' یہ کاسنی زرد گلابی..... یہ خودرو پھول کس قدر خوبصورت ہیں؟ کبھی وہ ان پھولوں پر منڈلانے والی کسی تتلی کو پکڑ لیتا اور اس کے رنگوں کو دیکھتا رہتا اور کبھی چیری کے پودوں کو دیکھ کر حیران ہوتا۔

یہ.... کیا یہ خود بخود اگ آئے ہیں۔ یہ پھل' یہ ننھے ننھے سرخ پھل۔''

''سید ثقلین شاہ جب کشمیر آزاد ہو جائے گا تو میں ان سب پر گیت لکھوں گا۔'' چیری کے ان پودوں پر' ان کاسنی زرد اور گلابی پھولوں پر۔''

وہ سید عابد قیصرانی شہید ہو گیا تھا جو صرف شاعری کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا اور جس نے اپنے نام کے ساتھ اپنے استاد کا نام لگا رکھا تھا اور جسے اس کے ماموں نے وادی کو واپس کر دیا تھا اس لیے کہ وادی کو اس کی ضرورت تھی اور آج شہید ہو کر اس نے اپنے ماموں کو سرخرو کر دیا تھا۔ اس ماموں کو جس نے اس کی پیدائش پر بہن کے سامنے جھولی پھیلائی تھی۔

''میرا آنگن بہت سونا ہے۔'' اور بہن نے بھائی کی پھیلائی ہوئی جھولی کی لاج رکھ لی تھی۔ اور جسے ماموں نے شہزادوں کی طرح پالا تھا..... اور ایک غیر ملک میں رہ کر بھی اس کی دینی تعلیم کا انتظام کیا تھا کہ بہن کے سامنے شرمندگی نہ ہو..... اور پھر اپنے شہزادے کو وادی کے حوالے کر دیا تھا کہ وادی کو اس کی ضرورت تھی۔

''سید عابد شاہ قیصرانی' تمہارا لہو رائیگاں نہیں جائے گا..... صبح آزادی ضرور طلوع ہو

گی۔"سید ثقلین شاہ نے ہاتھوں کی پشت سے آنکھوں سے چھلکنے والے قطرے رخساروں سے پونچھ کر آسمان کی طرف دیکھا تھا جو گہرے سیاہ بادلوں سے بھرتا جا رہا تھا اور پھر مجاہد رشید بٹ کو خدا حافظ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے چل پڑا تھا۔

کھلے میدان میں جنازے رکھے تھے' وہ ہجوم میں سے راستہ بناتا وہاں تک پہنچا تھا اور جھک کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ بلاشبہ الوہی خوشبوؤں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا...... یہ خوشبو دنیا کی تو نہیں تھی۔ یہ تو جنت کی خوشبو تھی جو عابد قیصرانی کے اردگرد پھیلی تھی اور یہ خوشبوئیں جنہیں وہ اتنے دنوں سے اپنے پاس محسوس کر رہے تھے' ان کے لیے نہیں تھیں' یہ تو عابد کے لیے تھیں۔ جنازے اٹھائے گئے تو آسمان سے بوندا باندی ہونے لگی۔ پانی کے قطرے بڑھ بڑھ کر شہیدوں کے چہرے چوم رہے تھے۔

اور اس رات بادل ٹوٹ کر برستے تھے اور عابد قیصرانی کے گھر برآمدے میں بیٹھے سید ثقلین شاہ اپنے سامنے بیٹھی زارا کی باتیں سن رہے تھے اور گاہے بگاہے نظر اٹھا کر اس کے چہرے پر بھی ڈال لیتے تھے۔ اس کا چہرہ شدت گریہ سے سوجا ہوا تھا۔ بڑی بڑی خوابناک آنکھیں بار بار نم ہو جاتی تھیں اور پھر اماں جان اور ابا جان کو زبردستی سونے بھیج کر وہ عابد قیصرانی کی ڈائری لے کر آ بیٹھی تھی۔ سیاہ شال کندھوں کے گرد لپیٹے ڈائری کے ورق الٹتی سیدہ زارا شاہ کو وہ جی بھر کر دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ یہ رات بڑی عجیب رات تھی۔ اس رات میں سید عابد شاہ قیصرانی کی جدائی کا دکھ بھی تھا اور اس کی شہادت کا مان بھی۔ ایسی راتیں کئی بار انہوں نے تصور میں دیکھی تھیں۔ وہ اور سیدہ زارا شاہ۔ برستی بارش کا حسن' چائے کا سماوار اور...... بارش تو آج بھی ٹوٹ کر برس رہی تھی بادل بھی سید عابد قیصرانی کو اپنے آنسوؤں سے خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔

اور سیدہ زارا شاہ بھی ان کے سامنے بیٹھی تھی اپنے تمام تر ملکوتی حسن سمیت لیکن دل جیسے اداسیوں کی گہری برف تلے ڈوبا ہوا تھا۔

"اور میں نے اس کی پیدائش کے بعد بہت کم اسے دیکھا۔ ایک یا دو بار...... اور اب جب وہ آیا تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔" سیدہ زارا شاہ نے بے دھیانی میں اس کی ڈائری کے ورق الٹتے ہوئے کہا۔

"وہ اس قدر خوبصورت ہو گیا تھا اور کتنا پڑھ لکھ لیا تھا اس نے۔ وہ ماموں سے ناراض تھا۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ ماموں نے اسے کیوں بھیج دیا ہے اور واپسی کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ وہ تو نازک جذبوں کو لفظوں کا پیرہن پہنانے والا شاعر تھا۔ وہ تو فطرت کا دیوانہ تھا۔ صبح ہوتے ہی

جنگل کی طرف نکل جاتا۔ وہ پتوں پر پڑے شبنم کے قطروں کو بھی حیرت اور خوشی سے دیکھتا تھا۔ وہ خون اور بارود سے نفرت کرتا تھا...... اور محبت کی نظمیں لکھتا تھا پھر آپ آئے' آپ کے اس دس روزہ قیام نے اس کی شاعری کا رنگ بدل دیا۔ وہ آزادی کی نظمیں لکھنے لگا۔ اسے خون اور بارود سے اب بھی نفرت تھی...... وہ آزادی کے جلو میں زعفران کے پھولوں کو کھلتا دیکھتا۔

"لیکن پھر اس کی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔ جس روز بھائی مطلوب شاہ کی شہادت کی خبر ان کے مجاہد ساتھیوں نے دی اور ابا جان نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے آزادی کی دعا مانگی تو وہ حیران حیران کھڑا بہت دیر تک بھائی مطلوب شاہ کو دیکھتا رہا۔

"سید مطلوب شاہ' جو اس کا ماں جایا تھا لیکن جسے ہوش سنبھالنے کے بعد پہلی بار وہ دیکھ رہا تھا یوں کہ ان کے سینے کے زخم سے ابھی تک خون بہہ بہہ کر ان کے لباس کو خون رنگ کر رہا تھا اور ان کی پیشانی سے روشنی کی کرنیں پھوٹتی تھیں اور ان کے بے جان جسم سے عجیب انوکھی سی خوشبو آتی تھی' تب ان کی روشن پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں نے اپنا منصب پہچان لیا ہے اور مجھے اب پتا چلا ہے کہ بابا نے مجھے وادی میں واپس کیوں بھیجا ہے۔"

اور اس رات اس نے قلم رکھ دیا تھا اور بھائی مطلوب حسین شاہ کی بھاری گن اور تھوڑے سے چنے اور کلچے لے کر صبح ہونے سے پہلے ہی آپ کے پاس جانے کے لیے گھر سے نکل پڑا تھا۔" سیدہ زارا دھیمے دھیمے بولتے بولتے چپ ہوئی تو سید ثقلین شاہ نے نگاہیں اٹھائے بغیر آہستہ سے کہا تھا۔

"اور پھر چھ سال سے وہ میرے ساتھ تھا۔ صبح دوپہر...... شام...... ہر لحہ۔" اور ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ انہیں سید عابد شاہ قیصرانی بے طرح یاد آیا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ کہیں کسی ہائیڈ آؤٹ میں چھپے ہوتے تو وہ انہیں آزادی کی نظمیں سناتا...... امید اور یقین کے لفظوں سے سجی نظمیں......

غم نہ کرو
آزادی کی صبح طلوع ہونے والی ہے
وادیوں میں بہتے لہو نے اس کی خبر دی ہے
اور چنار کے پتوں نے
ہوا کے سنگ پیغام بھیجے ہیں

آزادی کی صبح طلوع ہونے والی ہے۔
آؤ
ہم گیت گائیں
پیارے وطن کی آزادی کے گیت

اور اس رات

اوپر مشرقی پہاڑیوں کی بلندی پر بنے گلابی ریسٹ ہاؤس میں مقیم بھارتی فوج کے گوریلا دستے کے آفیسر سید عابد شاہ قیصرانی کی شہادت پر رات بھر بلیک ہارس اور رائل سلیوٹ کی بوتلیں کھول کر جشن مناتے رہے۔ یہ خوبصورت ریسٹ ہاؤس جو بے شمار گلابی خودرو پھولوں میں گھرا ہونے کی وجہ سے گلابی ریسٹ ہاؤس کہلاتا تھا اور نیچے وادی میں سید ثقلین شاہ گیلانی اور سیدہ زارا شاہ عابد قیصرانی کی ڈائری سے آزادی کی نظمیں پڑھتے رہے اور کبھی کبھی ان کی آنکھیں نم ہو جاتیں اور بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں کو وہ پلکوں تک آنے سے روک دیتے کہ شہید مرا نہیں کرتے۔

لیکن بادل ساری رات روئے تھے اور صبح آسمان بہت نکھرا ہوا اور صاف تھا۔ صبح کی اذان کے ساتھ سیدہ زارا نے عابد قیصرانی کی ڈائری بند کر [illegible] لیے اٹھتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ عابد شاہ نے بھی کتنا صحیح اور کتنا خوبصورت لکھا تھا۔

اے آزادی کی دلہن
تو بہت خوبصورت ہے
لیکن بہت ظالم ہے
تیرے رخساروں کا غازہ
ہمارے بیٹوں کے کفن سے تیار ہوا ہے
اور تیری مانگ میں ہم نے
اپنے سہاگ کے خون سے سیندور بھرا ہے
تیرے ہونٹوں کی سرخی نے
ہمارے لہو سے جلا پائی ہے
اے آزادی کی دلہن
تو بہت خوبصورت ہے

لیکن تو نے ہم سے بڑی قیمت لی ہے۔

اور جب وہ وضو کر کے نماز کے لیے کھڑے ہوئے ہی تھے کہ باہر کنڈی آہستہ سے بجی تھی شاید دوبارہ اور نماز پڑھتی سیدہ زارا نے یکدم نماز توڑ کر ان کا ہاتھ پکڑا تھا اور تقریباً انہیں کھینچتی ہوئی پیچھے اسٹور میں لے گئی تھی اور اس میں موجود کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے انہیں بتایا تھا کہ کسی انتہائی صورت میں وہ اس کھڑکی سے چھلانگ لگا کر جنگل کی طرف نکل جائیں اور خود دروازہ بند کر کے تیزی سے مین گیٹ کی طرف گئی تھی لیکن تب تک سید عابد شاہ کے والد بھی جاگ چکے تھے اور اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے انہوں نے دروازہ کھول دیا تھا اور پھر اندر کمرے میں زارا کی سسکیاں سن کر سید ثقلین شاہ اسٹور سے باہر نکل آئے تھے۔

کمانڈر زوروار شاہ آج کتنے مہینوں بعد آئے تھے۔

انہیں صبح سے ذرا پہلے عابد کی شہادت کی خبر ملی تھی...... اور پھر نماز پڑھ کر وہ ان کے ساتھ ہی باہر نکلے تھے۔ زوروار شاہ زیادہ دیر تک نہ رک سکتے تھے انہیں ایک بہت اہم مشن پر جانا تھا اور ان کے ساتھی نیچے جنگل میں انتظار کر رہے تھے اور وہ سب کا حوصلہ بڑھا کر عابد شاہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آئے تھے۔

اور سید ثقلین شاہ سیدہ زارا شاہ سے وہ نہ کہہ سکے تھے جو کہنا چاہتے تھے...... اور اس شام کے بعد کی شاموں میں ایسی کئی تھیں جب کسی کی ہائیڈ آؤٹ میں بازوؤں کا تکیہ بنائے لیٹے لیٹے انہوں نے زارا شاہ کو بہت بے حساب سوچا تھا لیکن وہ پھر کپواڑہ کے قریب اس گاؤں میں نہ جا سکے تھے جہاں اوپر مشرقی پہاڑیوں پر گلابی جنگلی پھولوں کے ڈھیر میں چھپا گلابی ریسٹ ہاؤس تھا جس کے بالکل قریب سے چشمہ پھوٹ رہا تھا اور نیچے عابد شاہ کی قیام گاہ تھی۔ جہاں سیدہ زارا شاہ تھی جس نے انہیں چنار کے پتے والی نظم دی تھی اور ماں جی تھیں' جن کے چہرے پر ممتا کا نور تھا اور بابا جان تھے۔ جنہوں نے دو بیٹوں کی شہادت کا دکھ بڑی بہادری سے برداشت کیا تھا اور تیسرے بیٹے کو بھی اس راہ پر چلتے دیکھتے تھے تو کہتے تھے۔

اگر مولا کی رضا اسی میں ہے کہ وطن کی مانگ میں اس کا بھی خون شامل ہو تو میں اس میں راضی ہوں لیکن وہ اس قیام گاہ تک اس رات کے بعد جا ہی نہ پائے تھے۔

☆ ☆ ☆

شاید ان کی منزل تو کہیں اور تھی اور ابھی نہ جانے کتنا سفر باقی تھا۔ ہر صبح کا آغاز وہ اس امید کے ساتھ کرتے کہ کیا خبر آج کا سورج وادی میں آزادی کی خبر کے ساتھ طلوع ہو۔ وہ مجاہدین

کے ساتھ ساتھ ہر محاذ پر آگے ہی آگے تھے۔ آقا جان اور اماں کو بھی دیکھے مہینے گزر جاتے۔ کئی بار زخمی ہوئے کئی بار گرفتار ہوتے ہوتے بچے لیکن ان کا سفر جاری تھا۔

وہ سب کچھ بھولے ہوئے تھے۔ آقا جان اور اماں جان سبطین اور حسنین حتیٰ کہ سیدہ زارا کو بھی جس کے نام پر دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جایا کرتی تھیں مگر اس روز رنگت لو اب میں دس سالہ مجاہد شاہین کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے جو تین بھارتی فوجیوں کو مارنے کے بعد شہید ہو گیا تھا اور جس نے اپنے والد اور جانی کی شہادت کے بعد مجاہدین کو جوائن کر لیا تھا اور بھارتی درندوں کے لیے عذاب بنا ہوا تھا کبھی ان کے اسلحے کے ڈپو میں تباہی مچا آتا اور کبھی ٹاسک فورس اور کبھی بلیک کیٹ کے آدمیوں میں ہنگامہ برپا کر دیتا۔ انہیں حسنین شاہ بے تحاشا یاد آیا تھا جسے کتنی ہی بار انہوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا کر گلی کی سیر کروائی تھی اور جس نے پچھلی بار بہت اعتماد اور یقین سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا۔

"اگر محمد بن قاسم اٹھارہ سال کی عمر میں فاتح سندھ بن سکتا ہے تو میں کیوں نہیں تحریک آزادی میں شامل ہو سکتا۔"

لیکن معلوم نہیں کیوں وہ انہیں بہت چھوٹا لگتا تھا پھر انہیں آقا جان اور اماں جان کے تنہا رہ جانے کا خیال تھا کہ وہ اسے منع کر رہے تھے لیکن جذ[illegible] رکھتے اور آج دس سالہ شاہین کو دیکھ کر انہیں شرمندگی سی [illegible] اور ننھے شہید کو دفناتے ہوئے کوئی دس بار انہوں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

"اس قوم کو اب آزادی حاصل کرنے سے کون روک سکتا ہے جس کے معصوم بچوں کے اندر بھی جذبہ آزادی اتنا گہرا اور شدید ہو کہ وہ مسکراتے ہوئے جام شہادت نوش کریں۔"

اور اس روز سری نگر کی طرف آتے ہوئے انہوں نے صبح آزادی کو اپنے تصور کے آسمان پر بار بار طلوع ہوتے دیکھا اور اس صبح کے روشن چہرے میں سید عابد شاہ و مجاہد شاہین اور دوسرے سینکڑوں مجاہدوں کے عکس دیکھے۔

وہ پورے ایک سال بعد سری نگر آئے تھے اور ہمیشہ کی طرح آقا جان تخت پر بیٹھے تھے اور حکیم ابو اسحاق سے باتیں کر رہے تھے۔ سامنے رحل پر قرآن رکھا تھا۔ شاید ابھی ابو اسحاق آئے ہوں گے اور اماں جان چائے بنا رہی ہوں گی۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا وہ ہلکی سی دستک دے کر اندر چلے آئے تھے اور آقا جان نے اٹھ کر ان کا اس طرح استقبال کیا تھا جیسے وہ ایک سال بعد نہیں آئے تھے بلکہ ابھی ابھی باہر گئے تھے اور چلے آئے تھے۔ ان کے سالوں بعد

آنے کے جیسے سب عادی ہو گئے ہوں۔

اماں جان نے ان کی پیشانی چوم کر انہیں آزادی نصیب ہونے کی دعا دی تھی اور پھر چائے کے ساتھ پکوڑے لے آئی تھیں جیسے جانتی ہوں کہ وہ بھوکے ہیں اور پھر چائے رکھ کر وہ قریب ہی بیٹھ کر مجاہدین کے لیے چنے کی تھیلیاں بنانے لگی تھیں۔ حکیم ابو اسحاق کے جانے کے بعد انہیں بتایا گیا کہ حسنین شاہ بھی مجاہدین میں شامل ہو گیا ہے اور یہاں ہی سری نگر کے قریب پہاڑیوں میں ان کا ٹھکانہ ہے اور مجاہدین کے اس گروہ نے کچھ ہی عرصے میں بھارتی فوج کو نیا کر رکھ دیا ہے۔ کبھی کبھار چھپ چھپ کر وہ ملنے آتا ہے کیونکہ پولیس آئے دن چھاپے مارتی رہتی ہے۔ ابھی دو دن قبل سبطین آیا تھا اور اس کے جانے کے ایک گھنٹہ بعد پولیس نے چھاپا مار دیا اور کافی مارا پیٹا۔

"آقا جان!" سید ثقلین شاہ نے بے اختیار آقا جان کے کمزور وجود کو بازوؤں میں لے کر ان کے ماتھے کے نیلوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے تھے۔

"ہم بوڑھے ہو گئے ہیں ثقلین شاہ۔ تمہارے ساتھ وادیوں اور جنگلوں میں آزادی کی جنگ نہیں لڑ سکتے تو یہ زخم ہی چہرے پر سجا کر خوش ہو لیتے ہیں کہ ہم بھی اس جنگ میں اس جہاد میں تمہارے ساتھ ہیں۔" وہ سید ثقلین شاہ کی طرف دیکھ کر مسکرائے تھے۔

"[illegible] حوصلہ [illegible] اور ہمارے متعلق مت سوچنا۔ ایسا نہ ہو کہ کسی جذباتی لمحے میں ہمارا خیال تمہارے اٹھتے قدموں کو روک دیں۔"

"نہیں آقا جان! ہمیں [illegible] پر فخر ہے۔"

اور اس روز اماں جان نے بہت شوق سے کشمیری پلاؤ پکایا تھا اور اس میں صحن کی کیاری سے سرسبز مرچیں توڑ کر ڈالی تھیں اور سوچ رہی تھیں "کیا ہی اچھا ہو کہ آج رات حسنین شاہ آ جائے [illegible] ہری مرچوں والا کشمیری پلاؤ بہت پسند ہے۔" اور سید ثقلین شاہ نے سوچا تھا کہ "کیا ہی اچھا ہو جو حسنین آ جائے اور وہ بھی اس سے مل لیں" اور مغرب سے ذرا پہلے اپنا ماؤزر اپنے لباس میں چھپا کر چادر اوڑھے وہ آقا جان سے اجازت لے کر گھر سے نکلے تھے تاکہ حضرت بل کی زیارت کر آئیں۔

اور آقا جان نے انہیں بہت احتیاط کی تاکید کی تھی کہ ان دنوں حضرت بل کی درگاہ کے باہر بھارتی فوجیوں کا پہرا ہے۔ جتنے وادی میں ہیں اس سے کہیں زیادہ عام لباس میں اور جب وہ حضرت بل پہنچے تو انہیں آقا جان کی بات بالکل صحیح لگی تھی۔ تب وہ اندر جانے کے بجائے جھیل کی طرف آ گئے تھے اور کتنی ہی دیر تک یونہی کھڑے جھیل میں تیرتے بجروں کو دیکھتے رہے تھے ایک دو

لوگوں نے آ کر ان سے چناروں والے جزیرے میں جانے کا پوچھا تھا لیکن انہوں نے منع کر دیا تھا۔ کبھی یہاں کتنی رونق ہوتی تھی۔ سرِ شام ہی لوگوں کا ہجوم ہو جاتا تھا اور جب وہ مائکل کے دھیان سے کھڑے تھے تو انہیں اپنے قریب سے ایک نسوانی آواز آئی تھی۔

"سید ثقلین شاہ!" انہوں نے یکدم پلٹ کر دیکھا تھا۔

"سیدہ زارا شاہ آپ یہاں؟" بڑی سی چادر میں اپنا چہرہ چھپائے سیدہ زارا شاہ کو انہوں نے اس کی بہت خوبصورت خوابناک آنکھوں سے پہچان لیا تھا۔

"میں زائرین کے ساتھ حضرت بل سے باہر نکل رہی تھی کہ میری نظر آپ پر پڑی اور پھر میں آپ کا تعاقب کرتی رہی۔"

"لیکن زارا آپ یہاں کیسے؟" وہ از حد حیران ہو رہے تھے۔ "یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔"

سیدہ زارا نے کن انکھیوں سے چاروں طرف دیکھا "آپ میرے ساتھ گھر چلیں۔"

اور پھر ہمیشہ کی طرح وہ مختلف گلیوں سے ہوتے حکیم ابو اسحاق کے مطب والے دروازے سے پچھلی گلی میں سے اسٹور کے راستے گھر آ گئے۔

آقا جان اور اماں جان سے تعارف کروا کے [illegible] کہا تھا اور دل بے طرح دھڑکا تھا۔ اندر کہیں بہت سارے چراغ ایک ساتھ جل اٹھے تھے۔

"ایک سال پہلے جس شام مجاہدین نے کپواڑہ میں بیرکمام کیمپ کی طرف جانے والے فوجیوں پر حملہ کر کے انہیں بے حد نقصان پہنچایا تھا ان کی کئی گاڑیاں تباہ ہوئی تھیں اور ہلاک ہونے والے فوجیوں میں ان کا میجر راجندر کمار بھی تھا جس نے تحریک آزادی کو بہت نقصان پہنچایا تھا اور جو اسی غرض سے کپواڑہ کیمپ جا رہا تھا کہ تحریک آزادی کے ایک ایک مجاہد کو چن کر شہید کر سکے۔ اسی شام میجر راجندر کمار کے دوست میجر دریا سنہ نے راجندر کا بدلہ لینے کے لیے گاؤں پر حملہ کر دیا تھا۔ کئی گھنٹے کی فائرنگ کے بعد پورے گاؤں کو آگ لگا دی تھی۔ بابا جان اور اماں جان شہید ہو گئے تھے گھر جل گیا اور میں دختران کشمیر کی تحریک میں شامل ہو گئی۔" سیدہ زارا شاہ بتا رہی تھی۔

"اور ایک سال سے عملی طور پر جہاد میں حصہ لے رہی ہوں۔" اماں جان اور بابا جان کی شہادت پر انہیں بہت دکھ ہوا تھا لیکن آزادی کی تاریخ کسی ایک شہادت سے تو نہیں لکھی جا رہی تھی اس میں سینکڑوں ہزاروں شہادتیں شامل تھیں۔

"سیدہ زارا آپ اس وقت کہاں مقیم ہیں؟"

"ہمارا کوئی خاص ٹھکانہ نہیں ہے۔ ہم تین دن قبل ہی یہاں پہنچے ہیں اور کل شام ایک بڑا احتجاجی جلوس نکال رہے ہیں خواتین کا جس کی قیادت آسیہ آپا کریں گی۔ کل رات ہم حضرت بل میں رہے تھے اور آج میرا ارادہ یہاں آسیہ آپا کی ایک کزن شمیم آپا کے گھر قیام کا تھا۔"

"بیٹا! جب تک آپ سری نگر ہوں تو یہاں قیام کرو۔ اگر کوئی مسئلہ نہ ہو تو" آقا جان نے بہت محبت سے کہا تو سیدہ زارا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس گھر میں آنا اور قیام کرنا ایک ایسا خواب تھا جسے آنکھیں نو برس سے دیکھ رہی تھیں اور دل نے بار ہا یہاں اس گھر میں سید ثقلین شاہ کے ساتھ آنے کی خواہش کی تھی اور شاید ثقلین شاہ کی آنکھوں میں بھی کوئی ایسا ہی خواب اتر آیا تھا کہ ان کے بھرے بھرے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ٹھہر گئی تھی اور پتا نہیں کیوں انہیں وہ رات یاد آ گئی تھی جب وادی میں بادل ٹوٹ کر برسے تھے اور وہ زمین پر دوزانو بیٹھے تھے اور ان کے بالکل سامنے سید عابد کی [illegible] سیدہ زارا بیٹھی تھیں اور ان کا دل عابد شاہ کی جدائی کے دکھ سے انتہائی بوجھل ہو رہا تھا۔ دو سال میں [illegible] کتنے لوگ بچھڑ گئے تھے۔

اور جانے اماں جان کو کیا خیال آیا تھا کہ انہوں نے یکدم اٹھ کر اپنی دائیں کلائی سے [illegible] کنگن اتار کر سیدہ زارا کی کلائیوں میں ڈال دیے تھے جو ان کی ساس نے رونمائی میں انہیں دیے تھے اور سید ثقلین شاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور گہری ہو گئی تھی۔ انہیں بہت پہلے کی اماں جان کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی تھی کہ یہ کنگن تو میں ثقلین شاہ کی دلہن کو دوں گی اور اس حقیقت سے بے خبر زارا شاہ نہ جانے کیوں شرما گئی تھی اور اس کے رخساروں پر ایسے رنگ اتر آئے تھے اور آنکھوں میں ایسے جگنو سے جھلملا اٹھے تھے کہ سید ثقلین شاہ کو لگا تھا جیسے وہ اختیار کھو بیٹھیں گے۔ اس لیے وہ [illegible] کے پاس سے اٹھ کر باہر آقا جان کے پاس جا بیٹھے تھے اور اندر اماں جان خوشی خوشی زارا شاہ سے کہہ رہی تھیں کہ آج سے وہ ان کی اور آقا جان کی بیٹی ہے اور آقا جان اور ثقلین شاہ سے بات کر کے وہ کسی مبارک ساعت میں دونوں کا نکاح کر دیں گی اگر زارا شاہ کو اعتراض نہ ہو۔

زارا شاہ نے سر جھکائے ہوئے بہت دھیمے لہجے میں یہ کہتے ہوئے کہ زارا شاہ کا پوچھا نہیں کہ وہ کہاں ہیں..... اپنے سارے اختیارات انہی کو دے دیے تھے۔

اور اس رات وہ سب ہی دیر تک جاگتے رہے تھے۔ سیدہ زارا شاہ نے عابد شاہ کو اور مطلوب حسین شاہ کو بے حد یاد کیا تھا اور بابا جان اور اماں جان کا ذکر کرتے ہوئے بے اختیار رو دی تھی۔

اماں جان نے پلاؤ دسترخوان پر رکھتے ہوئے بار بار حسنین شاہ کو یاد کیا تھا۔ حسنین شاہ

جو سب سے چھوٹا اور سب سے لاڈلا تھا اور پھر وہ حسنین شاہ کی اور سبطین کی چھوٹی چھوٹی باتیں زارا شاہ کو بتاتی رہی تھیں اور باہر آقا جان کے پلنگ کے ساتھ چارپائی بچھائے لیٹے سید ثقلین شاہ کی بند آنکھوں میں زارا شاہ کے مختلف روپ آتے رہے تھے۔

انہوں نے زارا شاہ کی رفاقت کی چاہ تو ضرور کی تھی لیکن ان کے تصور میں بھی نہ تھا کہ کسی روز زارا شاہ انہیں یوں مل جائے گی اور اماں جان اپنے کنگن اس کی کلائیوں میں ڈال دیں گی۔

"یہ بڑی خوبصورت رات تھی۔ چاندنی روشنی نے پورے آسمان کو روشن کر رکھا تھا اور موتیے کی مہک سے پورا آنگن مہک رہا تھا اور بڑے سالوں بعد وہ یوں اپنے گھر کے آنگن میں سکون سے سو رہے تھے اور جانے وہ صبحیں اور شامیں کب آئیں گی جب وہ اپنے اس خوبصورت گھر کے آنگن میں سکون سے سو سکیں گے اور وہیں تاروں سے بھرے آسمان کو تکتے ہوئے انہیں اپنی اور سبطین کے بچپن کی کئی باتیں یاد آئیں اور پھر وہ رات جب آقا جان کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔

ان کے ایک مضمون کی وجہ سے جس میں انہوں نے [illegible] کا سوال کیا تھا۔ وہ صحافی تھے اور طویل عرصے سے اخباروں میں لکھ رہے تھے اور چند ماہ پہلے ہی [illegible] نے اپنا ایک اخبار نکالا تھا "نوائے وطن" کے نام سے اور پھر چھ ماہ کی قید کاٹ کر جب وہ گھر آئے تھے تو انہوں نے آقا جان کو پہلے سے زیادہ پرجوش پایا تھا۔

"آزادی ناگزیر ہے۔" وہ کہا کرتے تھے۔

اور وہ حیران ہوتے کہ اتنے سالوں سے کشمیری جدوجہد کر رہے ہیں پھر بھی کشمیر آزاد کیوں نہیں ہو پاتا تب آقا جان نے انہیں سمجھایا تھا۔

"قوموں کی زندگیوں میں تبدیلیاں یکدم رونما نہیں ہوتیں اور نہ ہی لمحے آسمانوں سے تھال پر چک پڑتے ہیں یہ بتدریج ہوتی ہیں اور پھر آزادی کی جدوجہد تو بعض اوقات صدیوں پر محیط ہو جاتی ہے اور آزادی خون بھی مانگتی ہے۔ بہت جلد جہاد کشمیر اس مرحلے میں داخل ہو جائے گا۔ جسے مسلح جہاد کہتے ہیں۔"

اور آقا جان کی بات سچ ہوئی تھی۔ تقریباً دس سال سے یہ جہاد جاری تھا اور وہ بھی دس سال پہلے ہی اس جہادی تحریک سے وابستہ ہوئے تھے۔ اماں جان اور آقا جان بچپن میں انہیں اور سبطین کو دائیں بائیں بٹھا کر کشمیر کی کہانی اور ان مجاہدین کی کہانیاں ضرور سناتے تھے جنہوں نے

راہ حق میں یا وطن کی راہ میں جام شہادت نوش کیا اور یہ انہی کہانیوں کا اثر تھا کہ سبطین اور وہ اپنی تعلیم مکمل کرتے ہی تحریک جہاد سے وابستہ ہو گئے تھے اور دوران تعلیم بھی وہ اپنے طور پر آقا جان کے ساتھ مل کر کام کرتے رہے تھے۔ وہ اور سبطین بچپن میں ہمیشہ ساتھ رہتے تھے۔ اماں جان سبطین کو ان کا سایہ کہا کرتی تھیں اور سبطین ان کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام کر کہتا۔

"دیکھ لیجئے گا اماں جان ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے عمر کے آخری حصے تک۔"

"اور کیا پتا کہ تمہاری بیوی بہت لڑاکا ہو اور وہ تمہیں روک دے؟" سید ثقلین شاہ انہیں چھیڑتے تو سبطین کا رنگ سرخ ہو جاتا۔

"میں شادی نہیں کروں گا بھائی جان!"

اور پتہ نہیں جانے سبطین کہاں تھے۔ مہینوں وہ ایک دوسرے سے مل نہ پاتے تھے۔ ان دس سالوں میں بہت کم ایسا ہوا تھا کہ وہ ایک ہی وقت پر گھر آئے ہوں۔ "سبطین میرے بھائی اخدا ہمیں ہمارے مقصد میں کامیاب کرے تو پھر ہم ایک دوسرے کا سایہ بن کر ہی رہیں گے۔"

انہوں نے کروٹ بدلی تو ان کی نظر کمرے سے باہر آتی ہوئی زارا شاہ پر پڑی شاید وہ پانی پینے آئی تھی۔

"[illegible] وہ زارا شاہ [illegible] زیادتی تو نہیں کرنے والے۔" اماں جان نے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ شاید انہوں نے سید ثقلین شاہ کے دل میں جھانک لیا تھا۔ اور وہ ہمیشہ ہی ان کے دل میں جھانک لیا کرتی تھیں۔ ان کا نمکین چائے پینے کو دل چاہتا تھا تو وہ نمکین چائے لے کر آ جاتیں۔ نمکین چائے پیتے ہوئے وہ حیران ہو کر اماں جان کو دیکھتے۔

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ میرا جی چاہ رہا ہے چائے پینے کو؟"

"بیٹا ماں کو ہمیشہ اپنی اولاد کے دل کی خبر ہوتی ہے۔

یہ ماں اور اولاد کا بڑا انوکھا سا رشتہ ہے۔ اولاد ہزاروں میل دور بھی ہو تو ماں کو خبر ہوتی ہے کہ اس کے دل کے ٹکڑے تکلیف میں ہیں یا خوش۔"

ان کے دل کی خبر تو شاید اماں جان کو ہو گئی تھی لیکن زارا شاہ کا دل پتا نہیں وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھے۔ اگرچہ بہت پہلے ایک شام زارا شاہ نے اس کا اقرار کیا تھا پھر بھی بیچ میں کتنے ماہ و سال گزر گئے تھے۔

"زارا شاہ!" وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے قریب آئے۔

"یہ" انہوں نے کلائیوں میں موجود کنگنوں کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ جانتی ہیں ان کا مطلب اور آپ نے سنا تھا کہ اماں جان کیا کہہ رہی تھیں؟"

زارا نے سر ہلا دیا۔

"سیدہ زارا شاہ! آپ جانتی ہیں، میں موت کی راہوں کا مسافر ہوں۔ کیا خبر میں پھر کبھی دوبارہ آپ کو نہ ملوں ممکن ہے کل جب میں آپ سے بچھڑوں تو آپ کو میری شہادت کی خبر ملے۔ زارا شاہ! آپ کی رفاقت ہماری زندگی کی دوسری بڑی آرزو ہے لیکن آپ ہمارے بھائیوں سے بڑھ کر عزیز دوست کی بہن ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ ہم آپ کو خوشی کی بجائے "

"پلیز " سیدہ زارا شاہ نے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ "اس سفر میں ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ بھول رہے ہیں کہ ہم اپنی ساری عزیز ہستیاں اس جہاد کی نذر کر چکے ہیں اور آپ سال بھر پہلے ہم خود کو بھی جہاد کی اس تحریک میں عملی طور پر شامل کر چکے ہیں [illegible] رفاقت آپ کا نام اپنے نام کے ساتھ شامل ہونا ہمارے لیے ایسا اعزاز ہے جس پر ہم ہمیشہ فخر کریں گے۔ ہماری گردن ہمیشہ اونچی رہے گی کہ ہم ایک مجاہد کی رفیق حیات ہیں۔" اور سید ثقلین شاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ ہولے سے شب بخیر کہتے ہوئے اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئے لیکن نیند انہیں دیر سے آئی تھی اور ابھی انہیں سوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ [illegible] بے اختیار ان کا ہاتھ تکیے کے قریب پڑے ماؤزر پر پڑا تھا اور وہ جیسے [illegible] کی پھرتی سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے لیکن واش روم سے باہر آتے آقا جان نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ حسنین ہے۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔

"اس نے [illegible] بجا رکھی [illegible] میں وضو کر رہا تھا۔"

"حسنی میرے بھائی!" ماؤزر بیڈ پر ڈال کر وہ بے اختیار اس کی طرف بانہیں پھیلائے بڑھے۔

"ارے بھائی آپ" پھر جیسے پورا گھر ہی جاگ پڑا تھا۔ اماں جان اور آقا جان تو تہجد کے لیے اٹھے ہوئے ہی تھے۔ زارا شاہ اور ملازم لڑکا بھی جاگ اٹھے تھے اماں جان نے فوراً ہی چائے گرم کروایا تھا۔ دسترخوان پر رکھتے ہوئے بہت محبت سے اسے بتایا تھا کہ پتا نہیں کیوں، شام سے ہی ان کا دل کہہ رہا تھا کہ ان کا حسنین آئے گا۔

وہ فجر کی نماز تک حسنین سے ان کی سرگرمیوں کی تفصیل سنتے [illegible] رہے پھر انہوں نے اسے دس سالہ مجاہد شاہین کے متعلق بتایا۔ نماز پڑھ کر حسنین جب [illegible]

ہو گیا لیکن اماں جان نے اسے روک لیا۔

"آج عصر کے بعد تمہارے بھائی کا نکاح ہے رک جاؤ"

"لیکن اماں جان اس طرح اتنا اچانک ...؟"

"ہاں بیٹا! مجاہدوں کی زندگی میں واقعات یوں ہی اچانک ہوتے ہیں اور بڑے اہم کام بہت خاموشی اور آہستگی سے ہو جاتے ہیں کہ کیا خبر کل اس کا موقع نہ ملے اور پھر تمہارے بھائی کی شریک حیات بھی تو اسی راہ کی مسافر ہیں جس راہ کے مسافر تم اور ثقلین ہو۔" اور دوپہر تک اماں جان نے ایک دو عزیز خواتین کی مدد سے نہ صرف جوڑا تیار کر لیا تھا بلکہ اور بھی معمولی تیاری کر لی تھی

حسنین نکاح کے بعد چنے کی تھیلیاں اٹھا کر گھر سے باہر نکلا تھا تاکہ حکیم ابو اسحاق کے مطب میں پہنچا سکے جہاں سے کوئی نہ کوئی مجاہد اسے لے جاتا اور پھر وہ اپنے ساتھیوں کو پیغام بھی پہنچانا چاہتا تھا کہ وہ آج [illegible] کے کسی پیران سے آ ملے گا کہ گلی اچانک ہی بھارتی فوجیوں سے بھر گئی تھی۔

وہ پیچھے تنگ گلی میں مڑنا ہی چاہتا تھا کہ پیچھے سے دو فوجیوں نے اسے دبوچ لیا تھا اور پھر وہ اسے گھسیٹتے ہوئے گاڑی تک لے گئے تھے۔

"کہاں ہے تمہارا وہ کمانڈر بھائی؟"

ایک میجر نے اس کے منہ پر اپنے فوجی بوٹ سے ضرب لگائی تھی۔

"سنا ہے [illegible] ہے لیکن یہاں تو شادی کے کوئی آثار نہیں۔" اور پھر انہوں نے گلی کے ہر دروازے کا [illegible] دیا تھا۔ حسنین شاہ کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ان میں ثقلین شاہ اور زارا شاہ نہیں تھے گویا وہ محفوظ ہو گئے تھے۔ کچھ دیر ہنگامہ کرنے اور گھروں کی تلاشی لینے کے بعد فوجی اسی طرح گاڑیوں میں [illegible] کر واپس چلے گئے تھے مخبر کو غلط اطلاع پر گالیاں دیتے ہوئے۔

"چلو [illegible] نہ سہی اس کا بھائی تو ملا۔ سنا ہے یہ بھی پر نکال رہا ہے۔"

"اس کے پر کاٹ دو۔" میجر راجندر نے آرڈر دے دیا تھا۔

ساری رات آقا جان اور اماں جان نے جاگ کر نفل پڑھے تھے اور سید ثقلین شاہ مضطرب سے کبھی برآمدے اور کبھی صحن میں ٹہلتے رہے۔ زارا شاہ ان کے ساتھ تھیں۔ سادہ سے عروسی جوڑے میں ان کا حوصلہ بڑھاتی ہوئی پھر فجر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ وہ دروازے کی طرف لپکے تھے لیکن آقا جان نے انہیں روک دیا تھا۔

"آقا جان!" انہوں نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

"وطن کو تمہاری ضرورت ہے سید ثقلین۔" اور انہیں اندر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھے تھے۔ حکیم ابو اسحاق کے ساتھ خالد اندرابی تھے اور احمد شاہ تھے۔ فجر

کے بعد کسی وقت فوجی گاڑی حسین شاہ کی لاش گلی میں پھینک گئی تھی۔ آقا جان نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہید بیٹے کے استقبال کے لیے دروازے کھول دیے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے آقا جان کے گھر کا صحن لوگوں سے بھر گیا تھا۔ سید ثقلین شاہ نے جھک کر حسین شاہ کی پیشانی کو چومتے ہوئے آہستگی سے کہا تھا۔

"حسنی بیٹا تم ہم سے آگے نکل گئے"۔ جیسے بچپن میں اس کے ساتھ دوڑ لگاتے ہوئے وہ جھوٹ موٹ پیچھے رہ جاتے تھے اور وہ آگے نکل جاتے تھے لیکن آج تو وہ جھوٹ موٹ نہیں حقیقت میں ان سے آگے نکل گیا تھا۔

حسین شاہ جو کہتا تھا "محمد بن قاسم نے اٹھارہ سال کی عمر میں سندھ فتح کر لیا تھا تو وہ کیوں نہیں جہاد کر سکتا۔"

حسین شاہ جسے بچپن میں انہوں نے اپنے کندھوں پر بٹھا کر کتنی ہی بار گلی کے چکر لگائے تھے اور جو ان سے سبقت لے گیا تھا۔

انہوں نے جھک کر ایک بار پھر اس کی پیشانی کو چوما تھا۔ پورے صحن میں موتیے کی خوشبو کے ساتھ ایک اور مہک بھی پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی الوہی سی مہک اور حسین شاہ کے چہرے پر کسی اذیت کے آثار نہ تھے بلکہ ہونٹوں پر مسکراہٹ سی بکھری [illegible] ملا کر نہیں پڑے گا۔

اس کے سرہانے کے قریب دو زانو بیٹھتے ہوئے انہیں عابد شاہ قیصرانی یاد آ گیا اور عابد شاہ کی ڈائری کے ورق ان کی نگاہ کے سامنے پھڑپھڑائے گئے۔

اے آزادی کی دلہن
تو بہت خوبصورت ہے
اور تجھے پانے کی بہت چاہ ہے
اور تجھ تک پہنچنے کے لیے ابھی
جانے کتنے پل صراط طے کرنے ہیں
اور کتنے کشٹ اٹھانے ہیں
اے آزادی کی دلہن
میں نے اپنے پیاروں کا نذرانہ تجھے دیا ہے
تو اسے قبول کر

اور اپنا حسین گھبرو مجھے دکھا
کہ تجھے پانے کی بہت چاہ ہے۔

تب ہی سید وزارا شاہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں شدت گریہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ رات والے عروسی لباس میں ہی تھی۔ کیسی عروسی رات آئی تھی کہ دونوں ساری رات جاگتے رہے تھے وہ سید وزارا شاہ سے وہ سب کچھ نہ کہہ سکے تھے جو ان بیتے سالوں میں جنگلوں اور وادیوں میں انہوں نے اس کے لئے سوچا تھا۔ حالانکہ جب اماں جان نے اچانک ہی ان کے نکاح کا اعلان کیا تھا تو وہ سوچ رہے تھے کہ وہ سید وزارا کو بتائیں گے کہ ان کی دی ہوئی وہ نظم آج بھی ان کے پاس ہے اور جب اس نے انہیں وہ نظم دی تھی تو انہیں یوں لگا تھا جیسے برسوں پہلے کسی کشمیری لڑکی نے چنار کا پتا [illegible] اپنی محبت کا پیغام دیا ہو انہیں۔ لیکن ساری رات تو وہ صرف حسین کی باتیں کرتے رہے تھے اس کے لئے فکرمند تھے۔ پتا نہیں ان کا دل اتنا بجھا بجھا سا کیوں تھا اور کتنی ہی بار باہر صحن میں آ کر انہوں نے آقا جان کے پاس جا کر انہیں تسلی دینے کی کوشش کی تھی جو لکڑی کے تخت پر قرآن شریف کھولے بیٹھے تھے اور ہر بار ہی اماں جان نے جو قریب ہی زمین پر جائے نماز بچھائے بیٹھی تھیں انہیں اپنی دلہن کے پاس جانے کے لئے کہا تھا

[illegible] اور شاہ [illegible]

بھائی کے لیے آپ ہی کے جیسی بیوی ہونی چاہیے تھی۔

اور وزارا شاہ نے حسین کی بھوری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا۔

"حسین شاہ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنا بھائی عابد یاد آ گیا ہے تم آج سے میرے لئے عابد جیسے ہی ہو۔

"آپ ہمیشہ مجھے اپنے بھائی جیسا ہی پائیں گی۔"

حسین شاہ نے وعدہ کیا تھا اور وزارا شاہ کی آنکھوں میں جگنو چمک اٹھے تھے اور رات جگنوؤں کو انگلیوں کی پوروں سے چنتے ہوئے وزارا شاہ بے اختیار مسکرائی تھی اور اس نے حسین شاہ سے عابد شاہ قیصرانی کی ڈھیروں باتیں کی تھیں اور اس کی کتنی ہی نظمیں سنا ڈالی تھیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ
ہم پاگل ہیں
جو ہر روز اپنے پیاروں کو
خون کے دریا میں ڈوبتے دیکھتے ہیں

اور سبق حاصل نہیں کرتے
بلکہ خود بھی خون کے دریا میں
کودنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں
ہاں ہم پاگل ہیں
دیوانے ہیں
لیکن آزادی کی دیوی
دیوانوں کے قدموں پر ہی جھکتی ہے
اور اس راہ جنوں کے مسافر ہی
آزادی کے حسن سے ہم آغوش ہوتے ہیں
آؤ تم بھی اس راہ جنوں کے مسافر بن جاؤ
اگر تمہیں آزادی سے وصل کی خواہش ہے تو
آؤ راہ جنوں کے متوالو
آؤ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھو
آگے بڑھو
اور اس حسین وادی کو پالو

اور یہ نظم حسنین شاہ کو بہت پسند آئی تھی۔
اور وہ کتنی ہی دیر تک گنگنا تا رہا تھا
راہ جنوں کے متوالو
آؤ آزادی کی پری کو پانے کے لیے
نکلیں اور پھر اس کے وصل سے سرشار ہو جائیں
میں تمہیں عابد شاہ قیصرانی کی ڈائری دوں گی اس میں عابد کی بے شمار نظمیں ہیں اور وہ آخری نظم بھی جو شہادت سے ایک روز پہلے اس نے لکھی تھی۔ جب وہ تھوڑی دیر کو اپنے ہائیڈ ہاؤس سے نکل کر گھر آیا تھا اور اس نے سیدہ زارا شاہ کو وہ نظم سنائی تھی۔
"کیا آپ کو وہ نظم یاد ہے؟"
سید حسنین شاہ نے بے حد اشتیاق سے پوچھا تھا۔
"ہاں"

سیدہ زارا کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔
پتا نہیں آج رات
اتنی بوجھل کیوں ہے
زعفران اور چنار کی
خوشبو فضا میں رچی
جس کی مہک بڑی انوکھی ہے
شاید یہ آزادی کی دلہن
کے کنوارے جسم کی خوشبو میں ہزاروں
آرزوؤں اور تمناؤں کا
عطر گندھا ہے
اس لیے یہ اتنی بوجھل ہے
اور مجھ پر بھی ایک پر کیف
نیند طاری کر رہی ہے
[illegible]
اب [illegible] ہیں
ٹوٹنے والی ہیں
آ کر اپنے خوبصورت ہاتھوں سے
میری بوجھل آنکھیں بند کر دے
اور اپنی [illegible] آواز میں
ایک لوری گا
کہ آج کی رات میں پرسکون نیند سو جاؤں
اور آنسو ٹوٹ کر زارا شاہ کے رخساروں پر پھیل گئے تھے اور اس نے کتنا ہی چاہا تھا سید ثقلین شاہ کہ وہ ان موتیوں کو اپنی انگلی کی پوروں سے چن لیں اور حسنین شاہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کسی بزرگ کی طرح ہی زارا شاہ کو تسلی دی تھی۔
"شہید مرا نہیں کرتے آپا جان۔"
"ہاں"

"سید ثقلین شاہ"
زارا نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے کہا تھا۔
"حکیم ابو اسحاق سٹور میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" اور مڑ کر سید وزارا شاہ کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہی وہ سمجھ گئے تھے کہ وقت رخصت قریب آ گیا ہے۔ مڑ کر انہوں نے حسنین شاہ کو دیکھا تھا اور کتنا ہی چاہا تھا کہ وہ زارا شاہ کی بات نہ سنیں ابو اسحاق کے پاس نہ جائیں اور ایک رات صرف ایک رات اور رک جائیں اپنے اس لاڈلے دلارے بھائی کے جنازے میں شریک ہو جائیں۔ جسے بچپن میں کندھے پر بٹھا کر وہ گلیوں میں سیر کراتے تھے آج آخری بار اپنے کندھے کے سہارے اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا آئیں۔
اپنے ہاتھوں سے اس ملیح چہرے کو مٹی میں دفن کر دیں۔
لیکن زارا شاہ کی ملتجی نظریں اس پر جمی تھیں۔
"چلیے پلیز ثقلین شاہ۔"
اور زارا سے ہوتی ہوئی ان کی نظریں فوزیہ کی [illegible] سے ٹیک لگائے کھڑے آقا جان پر پڑی تھیں جن کی آنکھوں میں ویسی ہی التجا تھی [illegible] چہرے پر گھبراہٹ۔ انہوں نے جھک کر ایک بار حسنین شاہ کی روشن پیشانی پر بوسہ دیا تھا اور [illegible] کھڑے ہوئے تھے۔ حسنین شاہ کے چہرے کے گرد ایک نور کا ہالہ سا بن گیا تھا۔ انہیں ایسے [illegible] روشنیاں پھوٹ رہی ہوں اور پھر انہیں محسوس ہوا تھا جیسے حسنین نے چپکے سے انہیں اللہ حافظ کہا ہو۔ وہ ایک لمحہ ٹھٹکے اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتے لوگوں کے ہجوم میں سے راستہ بناتے صحن اور برآمدہ طے کرتے سٹور میں پہنچ گئے تھے جہاں حکیم ابو اسحاق بے چینی سے منتظر تھے۔
"بہت خطرہ ہے ثقلین شاہ۔ بھارتی بلیک کیٹس سادہ لباس میں جنازے کے ساتھ ہو گی ابھی بھی کچھ لوگ گلی میں چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں۔ ان کا خیال ہو گا کہ تم سری نگر [illegible] بھائی کے جنازے میں ضرور شریک ہو گے لہٰذا اس وقت تمہارا نکل جانا ہی بہتر ہے۔"
اور وہ دل پر بہت سارا بوجھ لیے چپ چاپ حکیم ابو اسحاق کے ساتھ سٹور کے پچھلے دروازے سے باہر نکل کر سیدھے حکیم ابو اسحاق کی بیٹھک میں آ گئے تھے اور پھر وہاں سے سکھوں والی پگڑی باندھ کر ایک سکھ مریض کی حیثیت سے وہ [illegible] میں سوار ہو کر اس گلی سے باہر آ گئے تھے۔ اس [illegible] میں چند دن پہلے ہی حکیم ابو اسحاق کا ایک مریض آیا تھا جس کی طبیعت کی خرابی کی بنا پر حکیم صاحب نے اسے مطب میں [illegible] اور یوں وہ اسی [illegible] میں بیٹھ کر گلی سے نکل

گئے تھے لیکن ان کا دل غم سے بوجھل ہو گیا تھا۔
گو انہوں نے بار بار اپنے دل کو یقین دلایا کہ یہ تو ہونا ہی ہے
پہلے عابد شاہ قیصرانی
پھر حسنین شاہ
اور پھر شاید کسی روز وہ خود
سب ایک ہی راستے کے مسافر تھے لیکن وہ اس دل کا کیا کرتے جو کعبہ نہ تھا جس میں انسانی رشتوں کی محبتیں گندھی تھیں۔
اس رات انہیں رہ رہ کر حسنین یاد آتا رہا۔
ادھر وہ سری نگر سے دور جنگل میں اپنے ٹھکانے پر تھکے ہارے آنکھیں موندے لیٹے رہے بار بار بند آنکھوں کے کٹوروں سے آنسو اودھم مچا دیتے تھے۔
جنہیں وہ لاشعوری کوشش سے پیچھے دھکیل دیتے اور ان سے کچھ فاصلے پر لیٹے کمانڈر مرتضیٰ جو بغور انہیں دیکھ رہے تھے اٹھ کر ان کے قریب آئے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"ثقلین شاہ"
ثقلین شاہ نے آنکھیں نہیں کھولیں اور یونہی آنکھیں بند کیے بولے۔
"جی کہیے میں سن رہا ہوں۔"
ان کی آواز بھاری تھی اور لہجے میں آنسوؤں کی نمی صاف محسوس ہو رہی تھی۔
"ثقلین شاہ آنکھیں کھولو اور اٹھو۔"
تب ثقلین شاہ نے آنکھیں کھول کر کمانڈر مرتضیٰ کو دیکھا اور اٹھ بیٹھے۔
"ثقلین شاہ۔"
کمانڈر مرتضیٰ نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ آؤ ثقلین شاہ ایک بار کھل کر جی بھر کر رو لو۔ حسنین شاہ کی شہادت پر نہیں بلکہ جان سے عزیز بھائی کی جدائی پر۔ اس چاند چہرے کے مٹی میں چھپ جانے پر جس پر تم نے بوسے دیے ہوں گے۔
اور خود پر ضبط کے پہرے بٹھائے سید ثقلین شاہ بے اختیار ہی کمانڈر مرتضیٰ کے پھیلے بازوؤں میں سما گئے اور کتنی ہی دیر تک ان کے کندھے پر سر رکھے خاموش آنسو بہاتے رہے کمانڈر مرتضیٰ نے ہولے سے تھپک کر انہیں الگ کیا۔
"یہ تھوڑا پانی اور کچھ چنے ہیں کھا لو تو تھوڑی دیر تک ہمیں آگے پہاڑوں میں جانا

ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ بھارتی فوج نے چند دیہات کے پار کاؤں سے چند بے گناہ بوڑھوں اور جوانوں کو پکڑ کر لا رہے ہیں۔ جن میں کمانڈر مصطفےٰ کے گھر والے بھی ہیں۔ شاید وہ سمجھتے ہیں اس طرح کمانڈر مصطفیٰ ان کے پاس خود ہی آ جائیں گے۔

"کمانڈر کے متعلق کوئی اطلاع؟"

رونے سے دل پر دھرا بوجھ کچھ کم ہو گیا تھا اور سید ثقلین شاہ نے پہلی بار خود کو قدرے بہتر محسوس کیا۔

"نہیں۔ اگر تم بہتر محسوس نہیں کر رہے ہو تو تم یہیں رک جاؤ۔ میں سلیمان اور حیدر کے ساتھ نکلتا ہوں۔"

"نہیں کمانڈر مرتضیٰ میں بہت بہتر فیل کر رہا ہوں۔"

سید ثقلین شاہ تھوڑے سے نادم ہوئے۔

"اپنی کمزوری پر ندامت ہے مجھے۔"

"یہ کمزوری نہیں سید ثقلین شاہ۔"

کمانڈر مرتضیٰ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔

"یہ محبت ہے اور یہ فطری ہے اور یہ موقع تو نہیں ہے [illegible] یاد دوں لیکن مجھے خوشی ہے کہ تمہیں ایک نیک اور شریف شریک حیات ملی ہے۔ آسیہ آپا اس کی بے حد تعریف کرتی ہیں۔"

اور سید ثقلین شاہ کو اس سارے عرصے میں پہلی بار سیدہ زہرا شاہ کا خیال آیا۔ سادا سے لباس میں بھی اس کا روپ کیسے نکھر آیا تھا۔ شاید بناپے کا حسن تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کمانڈر مرتضیٰ کی طرف دیکھا۔

"ہمیں کب روانہ ہونا ہے؟"

"تم کچھ کھا لو ثقلین شاہ۔"

"میرا جی نہیں چاہ رہا۔"

"شاید تم نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا اور آگے نہ جانے کتنی راتیں یوں ہی بنا کھائے پیئے گزر جائیں۔"

اور پھر اس نے تھوڑے سے چنے کھائے۔" اور کمانڈر مرتضیٰ کو سامان سمیٹتے دیکھنے لگا۔

تب ہی حیدر پتوں اور جھاڑیوں کو ہٹاتا ہوا اندر آیا۔ اس کے پیچھے بکروال محی الدین

تھا۔

"کیا خبر لائے ہو محی الدین۔"

"وہ لوگ وہاں سے روانہ ہو چکے ہیں اور میرے بندے کی اطلاع کے مطابق کمانڈر مصطفےٰ بھی پکڑ لیے گئے ہیں۔"

"اوہ۔"

کمانڈر مرتضیٰ کے ساتھ سید ثقلین شاہ نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔

"سفید ڈول کیمپ میں کمانڈر اور دوسرے قیدی ہیں۔"

کمانڈر مرتضیٰ نے سر ہلایا۔

بکروال اپنے ساتھ ایک ڈولی میں بکریوں کا دودھ بھی لایا تھا۔ جسے سید ثقلین شاہ اور کمانڈر مرتضیٰ [illegible] نے پینے کے لیے دیا۔ مٹی کے آب خوروں میں دودھ پی کر سید ثقلین شاہ باہر نکل آئے ان کے پیچھے کمانڈر مرتضیٰ اور حیدر بھی تھے۔

پھر سلیمان بھی وہیں پہ آ کر ان میں شامل ہو گیا محی الدین نے جھاڑیوں اور ایک درخت کے کٹے تنے سے ان کے ہائیڈ ہاؤس کو بند کر دیا اور دوسری طرف سے ٹیلے سے نیچے [illegible] پیچھے چلتے تاریک جنگل میں گم ہو گئے تھے۔

اور اس رات [illegible] انہوں نے بھارتی فوج کے سپاہیوں کو بہت نقصان پہنچایا تھا بلکہ کمانڈر مصطفےٰ اور ان کے عزیزوں کو بھی ان کے پنجے سے آزاد کرا لیا تھا اور بھارتی لڑاکے اپنے کئی ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور ان کا اسلحہ اکٹھا کرتے ہوئے کئی بار حسنین شاہ کا چہرہ ان کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تھا۔

"میرے رب مجھے استقامت عطا کر۔"

انہوں نے خاموش لبوں سے دعا کی تھی۔ میں ایک کمزور سا بندہ ہوں۔ مجھے دنیاوی محبتوں سے آزاد کر دے میرے مولا۔"

اور وہ ساری رات بھی بہت بے چین سی گزری تھی پچھلی شب کی طرح وہ پوری رات جاگے تھے۔

پچھلی شب اس کے ساتھ زہرا شاہ تھیں آغا جان تھے اماں جان تھیں اور آج شب ان میں سے کوئی بھی نہ تھا۔ کمانڈر مرتضیٰ نے حیدر اور سلیمان کو تاکید کی تھی کہ آج رات کمانڈر ثقلین شاہ کو آرام کرنے دو اور وہ دونوں ہی باری باری جاگتے رہے تھے لیکن سید ثقلین شاہ کو نیند نہیں

آ رہی تھی اور پھر صبح سے کچھ پہلے ہی ان کی آنکھ لگی تھی اور انہوں نے خواب میں حسنین شاہ کو دیکھا تھا۔ خلعت فاخرہ میں ملبوس ہنستا مسکراتا حسنین شاہ نور کے ہالے میں کھڑا تھا۔

"بھائی ہم نے تو منزل پالی۔"

"حسنین۔"

انہوں نے بے اختیار پکارا تھا اسے اور پھر حسن کے ساتھ نور کے اس غبار میں عابد شاہ قیصرانی بھی کھڑا مسکراہٹ لبوں پر سجائے انہیں دیکھ رہا تھا اور تب ہی سلیمان خوبیہ نے انہیں جھنجوڑ ڈالا۔

"کمانڈر اٹھیے۔"

انہوں نے نیند بھری آنکھوں سے ایک شکوہ بھری نظر اس پر ڈالی۔ ابھی تو انہوں نے ایک نظر ہی ڈالی تھی حسنین کے چہرے پر' کاش سلیمان نے انہیں کچھ دیر اور نہ جگایا ہوتا۔ وہ جی بھر کر اس چاند چہرے کو دیکھ لیتے۔

"کیا ہے سلیمان خوبیہ؟"

"ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا ہے میں نے ابھی دور جنگل میں گاڑیوں کی آواز سنی ہے کمانڈر مصطفیٰ کے ہاتھوں سے نکل جانے پر وہ یقیناً بلبلا [illegible] ساتھ آئے ہوں گے انہیں یقین ہوگا کہ ابھی مجاہدین آس پاس ہی ہوں گے اور وہ یقیناً ارد گرد کے علاقوں کو چھان ڈالیں گے اور غصے میں اندھا دھند گرنیڈ پھینکیں گے اور گولیاں چلائیں گے۔"

"ہاں"

سید ثقلین شاہ فوراً ہی اٹھ بیٹھے تھے اور تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے اپنے ساتھیوں نے ساتھ وہ جگہ چھوڑ دی تھی اور پھر اگلے کئی دن تک بھارتی فوج نے آس پاس کے علاقوں میں تباہی مچائی رکھی تھی اور سید ثقلین شاہ نے بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ان کے کئی اسلحے کے ڈپو اڑائے۔ کئی ٹھکانوں پر حملہ کیا اور میجر گھوش سمیت کئی افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ پورے چھ ماہ وہ بے حد مصروف رہے تھے۔ کہیں کسی جگہ ٹک کر بیٹھنے کا انہیں موقع نہیں ملا تھا۔ بلیک کیٹ کے گرگے ہر جگہ ان کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ ان کو یہ تو نہیں معلوم تھا کہ ان کے اسلحے کے سب سے بڑے ڈپو کو آگ لگانے اور میجر گھوش کو ہلاک کرنے والا کون تھا تاہم انہیں کمانڈر مرتضیٰ' کمانڈر مصطفیٰ اور کمانڈر سید ثقلین شاہ کی تلاش تھی' وہ اس کوشش میں کتنی ہی بار انہوں نے ان کے گھر پر بھی چھاپا مارا تھا اور چھاپے سے پہلے ہی آقا جان نے سیدہ زارا شاہ کو حکیم ابو اسحاق کے ساتھ آسیہ آپا کی

طرف بھجوا دیا تھا اور وہ ناکام و نامراد لوٹے تھے۔

اس رات وہ ٹاسک فورس کے ایک کیمپ میں بارودی دھماکہ کر کے بارہ مولا سے کئی کوس کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے گاؤں میں امیر مختار کے گھر میں زمین پر بچھی دری پر لیٹے اپنے اگلے اقدام کے متعلق سوچ رہے تھے۔ واپسی میں ان کے ساتھی مجاہد بچھڑ گئے تھے اور وہ اکیلے ہی یہاں تک پہنچے تھے اور امیر مختار کے گھر کے دروازے پر دستک دی تھی امیر مختار کا گھر بھی جو ایک چھوٹی سی پہاڑی کے عقب میں تھا ان کا ایک خفیہ ٹھکانہ تھا۔ امیر مختار کے دادا بکریاں چراتے تھے اور ان کے ساتھ یہاں ان کی بوڑھی بیوی رہتی تھیں اور وہ دونوں ہمہ وقت مجاہدین کی مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔

سو سید ثقلین شاہ کا استقبال بھی انہوں نے خوش دلی سے کیا تھا۔

"بڑے دنوں بعد آئے ہو بیٹا اس طرف۔"

"کوئی خطرہ تو نہیں۔"

بہت دنوں سے تو ادھر کسی نے نہیں جھانکا۔

دادا کے چہرے پر اطمینان تھا ہاں دو ہفتے پہلے ٹاسک فورس کے کچھ بندے ادھر آ نکلے تھے اور تو کچھ [illegible] میری [illegible] بکریاں ہی لے گئے۔ ماس نہ کھانے والوں نے رات کیمپ میں [illegible] جاموں کے ساتھ چلو تم آرام کر لو کچھ دیر تو پھر کھانا کھاتے ہیں۔ میں اس اثناء میں ذرا اپنی بکریوں کو دیکھ لوں۔ امیر مختار کے دادا کا پیشہ بکریاں چرانا تو نہ تھا۔ کچھ برس پیشتر سری نگر میں ان کی بہت بڑی دوکان تھی جہاں ہر طرح کی کشمیری شالیں ملتی تھیں لیکن جب بیٹے اور بہو کو شہید کر دیا گیا اور اکلوتا پوتا مجاہدین میں شامل ہو گیا تو وہ بھی یہاں اس پہاڑی کے دامن میں اٹھ آئے اور مجاہدین کی مدد کرنے لگے۔ یہ بکریوں کے ریوڑ تو محض [illegible]۔ وہ پچھلے کئی سال سے مجاہدین کی پیغام رسانی کا کام بھی کر رہے تھے۔

"اور کیا خبر کہ انہیں سبطین کی کچھ خبر ہو۔"

سید ثقلین شاہ کو اچانک ہی خیال آیا تھا۔ پورا ایک سال ہو گیا تھا انہوں نے سبطین کو نہیں دیکھا تھا کئی بار ایسا ہوا کہ وہ کہیں گئے تو انہیں پتا چلا کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی سبطین یہاں تھا۔ سال بھر پہلے جب وہ گھر گئے تھے تو تب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ آقا جان نے بتایا تھا کہ چند منٹ پہلے سبطین گیا ہے۔

پتا نہیں کیوں وقت ان سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا یکایک ہی ان کا دل بے

تماشا چاہنے لگا کہ کہیں سے سبطین آ جائے اور وہ اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں اور کچھ دیر اس کے ساتھ حسنین کی یادیں شیئرز کریں۔

وہ بے اختیار اٹھ کھڑے ہوئے تھے تا کہ باہر نکل کر دادا سے اس کے متعلق پوچھیں کہ قدموں کی آہٹ پر وہ چیتے کی سی تیزی سے اچھل کر دروازے کے پیچھے ہو گئے اور اپنی گن اٹھالی تب ہی کوئی کسی کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اندر داخل ہوا تھا اور ان دونوں کے پیچھے دادا تھے آنے والے کو دیکھ کر گن ان کے ہاتھ سے گر پڑی۔

"سبطین"۔

بے اختیار بازو پھیلائے وہ آگے بڑھے تھے اور پھر کتنی ہی دیر اسے سینے سے لگائے محبت کی اس کی حرارت کو محسوس کرتے رہے تھے جو اس کے سینے میں دھڑکتے دل سے نکل رہی تھی۔

"کیسے ہو سبط یار؟"

ان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

اپنے سے الگ کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔ تو سبطین مسکرا دیا۔

"بالکل ٹھیک بھائی۔"

وہ بہت مطمئن لگ رہا تھا اور پیشانی کسی الوہی نور سے دمک رہی تھی۔ انہوں نے ایک بار پھر اس کی روشن پیشانی پر بوسہ دیا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ آنے والا اجنبی بھی دادا سے باتیں کرتا ہوا بیٹھ چکا تھا۔

"بھائی یہ عمیر علی ہے پاکستان سے آیا ہے ہمارے ساتھ شامل ہونے"

عمیر ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ بیس اکیس سال کے اس جوان کے چہرے پر بلا کی ملاحت تھی۔ چھوٹی سی سیاہ داڑھی اس کے چہرے پر خوب سج رہی تھی۔

"خوش آمدید"۔

انہوں نے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔

یہ عمر اور یہ جذبہ شوق۔

ان کی آنکھوں میں اس کے لیے تحسین تھی۔

وہ اگر وادیوں اور جنگلوں میں گھر چھوڑ کر بھٹک رہے تھے تو اپنے وطن کی آزادی کے

لیے اور یہ نوجوان جو سر جھکائے ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس آزادی بھی تھی اور اپنا وطن بھی پھر یہ ساری آسائشیں چھوڑ کر یہاں ان کا ساتھ دینے آیا تھا تو کیوں؟ وہ کون سا جذبہ تھا جس نے اسے گھر والوں عزیزوں اور رشتہ داروں سے جدا کر دیا تھا اور پتا نہیں پھر وہ واپس بھی جا سکے گا یا نہیں۔ یقیناً اس کا جذبہ بہت قابل قدر تھا انہوں نے بڑی فراخدلی سے اس کے جذبے کو سراہا تو اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یہ جذبے تو خود بخود دل کی زمین سے پھوٹتے ہیں ایک دن میں نے حدیث پڑھی۔

وجاهدو فی سبیل الله تفلحون

"اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو تا کہ فلاح پاؤ۔"

اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے یہاں آنا ہے۔

"عمیر علی تمہارا آنا ہمارے لیے مبارک ثابت ہو"

سید ثقلین مسکرائے تب ہی امیر مختار کی دادی ایک ٹرے میں شہد ملے دودھ کے پیالے اور سوکھی خوبانیاں رکھ کر لے آئیں۔

"بچوں یہ دودھ پیو اور خوبانیاں کھاؤ۔ کیونکہ کھانے میں کچھ دیر ہے اور تم نہ جانے کب سے بھوکے ہو گے۔"

"السلام علیکم ماں جی۔"

سید سبطین شاہ نے اٹھ کر انہیں تعظیم دی تو ان کے ہونٹوں پر شفیق سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"جیتے رہو بچے خدا تمہیں آزادی نصیب کرے۔"

اور بوڑھی دادی کو جن کے چہرے کی جھریوں میں ماں کی شفقت تھی اور ہونٹوں پر دعائیں تھیں دیکھ کر سید ثقلین شاہ کو بے اختیار اماں بی یاد آ گئیں اور نیم گرم دودھ کا پیالہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے سبطین سے پوچھا۔

"آغا جان اور اماں جان کا کچھ پتا ہے۔ کیسی ہیں۔ کب ملے تھے تم ان سے؟"

مجھے تو بہت دن ہو گئے تقریباً آٹھ ماہ ایک بار گیا تھا درمیان میں لیکن گلی کے باہر ہی مجھے شیر دل ہائی مل گیا تھا اس نے بتایا تھا کہ ادھر گلی میں بہت فورس ہے سو واپس چلا گیا پھر جانا ہی نہ ہو سکا۔ آپ کب ملے تھے ان سے؟"

"تقریباً چھ ساڑھے چھ ماہ پہلے۔"

"اور کیسے تھے اماں جان اور آقا جان"
سبطین نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔
"اچھے تھے بس اماں جان کو معمولی سی سانس کی تکلیف تھی۔"
"کیوں کیا حکیم ابو اسحاق نے انہیں دوا دینی چھوڑ دی۔"
سبطین نے قہقہہ لگایا۔
وہ ابھی تک ویسا ہی تھا زندہ دل۔
"اور وہ ہمارا شہزادہ کیا ہے حسنین۔ ایک بار ابو ہریرہ ملے تھے بتا رہے تھے کہ وہ بھی تحریک جہاد میں شامل ہو گیا ہے۔"
"حسنین کے ذکر سے اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی وہ اس کو بھی تو بہت پیار اتھا بہت لاڈ اٹھائے تھے سبطین شاہ نے بھی اس کے سید ثقلین شاہ کی نظریں جھک گئیں۔ اندر کہیں دل میں کسی نے نوحہ پڑھا۔
وہ میرا شیر دل بہادر
پتھریلی زمین پر یوں پڑا تھا
کہ خون اس کے سینے سے ابل رہا تھا
میں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی
اور فخر سے سر بلند کر کے
آسمان کی طرف
شکر کی نگاہ سے دیکھا
کہ اس نے پیٹھ پر زخم نہیں کھایا تھا۔
"کیسا ہے وہ؟"
ان کی خاموشی نے جیسے سبطین شاہ کو کوئی ادراک دیا تو وہ لہجے کی بے قراری پر قابو نہ رکھ سکا۔
"وہ۔"
"شہید" ثقلین شاہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا ان کی آنکھوں کی سطح پر نمی چمک رہی تھی۔
"ہمارا شہزادہ ہمارا شیر دل ہم دونوں سے سبقت لے گیا سبطین اس نے جام شہادت نوش کر لیا اور ہم......"

سید سبطین شاہ کے ہونٹ یکدم بھینچ گئے تھے اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ ایک سال یا شاید سال بھر سے بھی کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا انہیں اس سے ملے۔ پچھلی بار جب وہ آقا جان اور اماں جان سے ملنے گئے تھے تو وہ پازل کیا ہوا تھا۔ اپنے چند مجاہدین دوستوں کے ساتھ۔
"انا للہ وانا الیہ راجعون"
انہوں نے آہستگی سے کہا اور سبطین کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھا۔
میرے آقا و مولا جناب محمد ﷺ فرماتے ہیں۔
"جو شخص جنت میں چلا جائے پھر اس کو دنیا میں آنے کی آرزو نہ رہے گی اگرچہ اس کو ساری زمین کی چیزیں دی جائیں لیکن شہید پھر آنے اور دس بار شہید ہونے کی آرزو کرے گا کیونکہ وہ شہادت کے درجہ کو دیکھ چکا ہوگا۔"
سبطین نے جھکا ہوا سر نہیں اٹھایا اور آنسو پینے کی کوشش کرتا رہا کتنے ہی منظر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ حسنین کے ساتھ وہ صحن میں کرکٹ کھیلتے۔
اسے کہانیاں سناتے۔
اسے پڑھاتے۔
[illegible] خاموش سر جھکائے بیٹھے رہے۔ تب سید ثقلین شاہ نے سبطین شاہ کا ہاتھ تھام کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی اس کا زخم تازہ تھا۔
وہ تو ان چھ سات ماہ میں مسلسل خود کو یقین دلاتے رہے تھے کہ وہ ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کی خاطر ان سے جدا ہوا ہے اور اس نے شہادت کا مرتبہ پا لیا۔ بلاشبہ شہید مرتے نہیں بلکہ وہ زندہ ہیں۔
سید سبطین نے نظریں اٹھائیں۔ ان کی آنکھوں کی سرخی گہری ہو گئی تھی اور عزیز بھائی سے بچھڑنے کا دکھ وہاں ڈیرہ جمائے تھا۔
"بھائی وہ سچ مچ ہم سے سبقت لے گیا۔"
سید سبطین کی آواز بھرائی ہوئی تھی سید ثقلین شاہ نے بازو بڑھا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور کتنی ہی دیر تک ان کے کندھے پر سر رکھے وہ خاموش آنسو بہاتا رہا پھر خود سنبھل کر سیدھا ہو گیا۔
اماں جان اور آقا جان تو بہت اکیلے ہوں گے پہلے کم از کم حسنین تو تھا ان کے

اس نے چھپا کے آپ سے بات کی۔"
"نہیں ان کے پاس زارا ہے۔"
"زارا۔"

سبطین کی سوالیہ نظریں ان کی طرف اٹھیں اور وہ ہولے ہولے انہیں تفصیل بتانے لگے۔ کمانڈر عابد شاہ قیصرانی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"کمانڈر عابد کی شہادت کی خبر مجھے "کندو ودوا" میں ملی تھی مجھے بڑی آرزو تھی کہ کبھی کمانڈر عابد سے ان کی نظمیں سنوں۔"

سبطین شاہ نے عابد کے ذکر پر کہا۔

"اس کی ڈائری زارا کے پاس ہے۔ کبھی سری نگر جاؤ تو زارا سے سننا اس کے گیت اور نظمیں۔"

"ہاں میں عمیر علی کو امیر مختار کے حوالے کر کے سری نگر جاؤں گا۔ بہت دن ہو گئے آقا جان اور اماں جان سے ملے۔ اب زارا بھابی سے بھی تو ملنا ہے۔"

"ہاں ضروری جانا سبطین وہ بہت اداس ہوں گے تمہارے لئے اور پھر حسنین بھی تو۔"

"اور آپ کب جا رہے ہیں؟"

"میں یہاں سے سیدھا سری نگر ہی جاؤں گا۔ پتا نہیں اماں جان اور آقا جان کا کیا حال ہے۔ وہ حسنین سے محبت بھی تو بہت کرتے تھے۔ میں تو اس کی شہادت کے روز جو گھر سے نکلا تو پھر گیا ہی نہیں۔"

"تو ٹھیک ہے میں عمیر علی کو چھوڑ کر آپ سے آملوں گا آپ وہاں میرا انتظار کیجئے گا۔ کچھ دن اکٹھے رہیں گے وہاں۔"

"انشاء اللہ۔"

سید ثقلین شاہ نے آہستگی سے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ باہر کی صورت حال کا جائزہ لے سکیں اور پھر کھانا کھا کر وہ اکٹھے ہی روانہ ہوئے تھے اور کچھ دور جا کر دونوں ہی الگ الگ راستوں پر ہو گئے تھے اور وہ خود سری نگر جانا چاہ رہے تھے لیکن راستے میں ان کا خیال کمانڈر مرتضیٰ سے بھی ملنے کا تھا تاکہ آگے کا لائحہ عمل بھی طے کر لیا جائے۔

اور پھر چند دن گھر پر رہ کر انہیں واپس آنا تھا۔

کاش اس بار کوئی ایسا معجزہ ہو جائے کہ وہ بغیر کسی پریشانی کے چند دن سکون سے گھر پر رہ سکیں زارا کا زرد چہرہ۔

سوچتی آنکھیں۔

ان کے تصور میں آ گئیں۔

"پتا نہیں کیسی ہو گی وہ۔"

شاید ہر روز وہ ان کی راہ دیکھتی ہو گی۔ وہ ایک دن کی بیاہی دلہن جسے وہ جی بھر کر دیکھ بھی نہ سکے تھے۔ وہ زارا اماں جان اور ابا جان سب کے متعلق سوچتے اپنا سفر طے کرتے ہوئے رات کے پچھلے پہر جب ایک ہائیڈ آؤٹ میں پہنچے تو وہاں کمانڈر مرتضیٰ کو دیکھ کر انہیں بے حد خوشی ہوئی میرا خیال تھا کہ آپ "کپواڑہ" میں ہوں گے۔

"میں کل رات ہی ادھر آیا ہوں۔"

بھارتی کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ کل رات ہمارا مشن بہت کامیاب رہا لیکن اس تباہی نے انہیں پاگل کر دیا ہے۔"

"پھر تو یہاں بھی آپ کے لیے خطرہ ہے کمانڈر مرتضیٰ۔"

ثقلین شاہ پریشان ہو گئے تھے۔

"نہیں یہ جگہ بہت محفوظ ہے ورنہ نیچے وادی میں ہمارے کئی مخبر ہیں۔ ذرا سا بھی خطرہ ہوا تو وہ خبر کر دیں گے ملک میں۔ بہتر سمجھتا ہوں کہ تم بھی کچھ دن یہاں ہی رہو۔ میں فی الوقت تمہارا سری نگر جانا مناسب نہیں سمجھتا سید ثقلین شاہ۔"

"لیکن انہوں نے سبطین سے وعدہ کیا تھا اور پھر شاید اندر کہیں دل کے کسی انجانے گوشے میں زارا کو دیکھنے کی خواہش بھی مچل رہی تھی کہ وہ کمانڈر مرتضیٰ کو تسلی دے کر وہاں سے نکل آئے تھے۔

اور حسب معمول "موئے مبارک" کی زیارت کر کے وہ حضرت بل سے زائرین کے گروہ کے ساتھ نکل کر مختلف گلیوں اور راستوں سے ہو کر سیدھے حکیم ابو اسحاق کے مطب میں پہنچے تھے۔ جہاں دو تین مریض موجود تھے ابو اسحاق نے آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور اپنی باری پر جب انہوں نے اپنا بازو آگے بڑھایا تو ان کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے حکیم ابو اسحاق مسکرائے "اب تو سب ٹھیک ہے شیخ صاحب بے فکر ہو جائیں۔ کسی دوا کی ضرورت نہیں ہے۔"

اور وہ حکیم صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مطب سے باہر نکل آئے تھے اور سامنے
بینچ پر بیٹھی ہندو مریضہ نے جس کی نظر اچانک ہی ان کی روشن پیشانی پر پڑی تھی اور پھر جیسے نظریں
ان کے روشن چہرے پر ٹک سی گئی تھیں۔ چونک کر حکیم صاحب کی طرف دیکھا تھا۔

"حکیم صاحب یہ تو کوئی نیک بزرگ معلوم ہوتے ہیں آپ ان سے میرے لئے دعا
کرواتے حکیم صاحب۔ اب تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔"

بی بی صبر کرو انشاء اللہ اللہ شفاء دے گا اور شیخ صاحب پھر کبھی مطب پر تشریف لائے تو
ضرور دعا کے لئے عرض کروں گا۔"

اور ہندو مریضہ نے دل ہی دل میں سوچا۔

بھلا اس نیک بندے کو حکیم صاحب کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی اور پھر حکیم
صاحب کی پیشانی پر سجدوں کے نشان کو دیکھا اور سوچا۔ اپنے حکیم صاحب کے ہاتھوں میں بھی
بہت شفا ہے زائل کو ڈاکٹروں نے تو جواب ہی دے دیا تھا، حکیم صاحب نے مرض پہچان لیا تھا۔

اور سید ثقلین شاہ نے گھر کے دروازے پر دھڑکتے دل سے ہاتھ رکھا جو کھلتا چلا گیا، آقا
جان کی عادت تھی وہ اور سبطین گھر پر نہ ہوتے تو اکثر ڈیوڑھی کے دروازے کی کنڈی نہیں لگاتے
تھے کہ انہیں دروازہ کھلنے کے انتظار میں کھڑا نہ ہونا پڑے [illegible] کچن
دروازے پر کھڑی زارا شاہ نے مڑ کر پیچھے دیکھا تھا اور پھر جیسے وقت ٹھہر سا گیا تھا۔ وہ ایک ٹک
انہیں دیکھے جا رہی تھی اور ان کے سینے میں دھڑکتا دل بیتاب ہوا تھا اور بے اختیار قدم اٹھا کر وہ
رک سے گئے تھے جیسے مڑ کر دروازے کی کنڈی لگا کر مڑے تو زارا شاہ وہیں کھڑی تھیں اور اس کی
آنکھوں میں پانی کی نمی پھیلتی جا رہی تھی۔

"السلام علیکم۔"

وہ اس کی صورت آنکھوں میں سماتے اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔

"وعلیکم السلام۔"

زارا شاہ کی پلکیں جھکیں اور انہوں نے دیکھا نوک مژگاں پر ستارے سے ٹکے تھے۔

"کیسی ہو؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

اس نے ذرا کی ذرا پلکیں اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر مڑ کر باورچی خانے کی طرف دیکھتے
ہوئے آہستہ آواز میں کہا۔

"اماں جان ثقلین آئے ہیں۔"

اور اس کے چہرے سے بمشکل نظر ہٹا کر وہ تیزی سے باورچی خانے کی طرف بڑھے
تھے۔

اماں جان نے پیڑھی پر بیٹھے بیٹھے ان کی پیشانی چومتے ہوئے انہیں گلے لگا لیا تھا اور
ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے دبے لفظوں میں کہا تھا۔

"ثقلین شاہ اتنے مہینوں میں خبر تک نہ لی ہماری تو خیر ہے دلہن کا خیال کر لیتے۔"

"کیا زارا نے کچھ کہا۔"

ان کا دل بجھ سا گیا۔

"نہیں بیٹا اس نے کیا کہا ہے بس میرے ہی دل میں خیال آیا تھا کہ نکاح کے بعد ہی
چلے گئے اور پھر [illegible]"

اور وہ مطمئن سے ہو کر وہاں ہی کچن میں ایک طرف بچھے کمبل پر بیٹھ گئے تھے۔

"اماں جان زارا جانتی ہے کہ اس کا شوہر آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے۔"

تب ہی آقا جان بھی زہرا کے بتانے پر کچن میں آ گئے تھے۔

[illegible] لگ گئی۔ رات بڑی بے چین سی تھی پتا نہیں کیوں شاید
[illegible]

وہ مسکرائے تھے اور پھر بہت دیر تک وہ چاروں کچن میں ہی بیٹھے باتیں کرتے رہے
تھے اور گاہے بگاہے نظر اٹھا کر اماں جان کے پاس بیٹھی زارا کو بھی دیکھ لیتے تھے۔ انہوں نے سبطین
کی آمد کا بھی بتایا تھا۔ آقا جان اور اماں جان جہاں ان کی آمد کا سن کر خوش ہوئے تھے وہاں
پریشان بھی ہو گئے تھے۔

"بیٹا باہر نہ نکلنا اور کسی سے سبطین کے آنے کا ذکر نہ کرنا۔" اماں جان نے تنبیہ کی۔

"کہیں کوئی مخبری ہی نہ کر دے ابھی ہفتہ بھر پہلے ہی پولیس والے تمہارا اور سبطین کا
پوچھ کر گئے ہیں۔"

وہاں ہی کچن میں سب کے ساتھ کھانا کھا کر وہ دیر تک تحریک آزادی کی اور حسنین کی
باتیں کرتے رہے تھے اور جب آقا جان عصر کی نماز کے لئے باہر گئے تو ان کی تاکید پر وہ گھر میں
ہی نماز ادا کر کے اماں جان کے اصرار پر اپنے کمرے میں آرام کے لئے لیٹے تھے کہ زارا شاہ سبز
کشمیری چائے لے کر کمرے میں ہی چلی آئی۔ اس کی پلکیں حیا کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں اور
سنہری رنگت سرخ ہو رہی تھی۔

"زارا"

انہوں نے دلچسپی سے اسے دیکھا اور ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"تم شاید مجھ سے ناراض ہوگی کہ میں نے اتنے مہینوں سے تمہاری خبر نہیں لی لیکن زارا شاہ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میری رفاقت شاید تمہیں کوئی خوشی نہ دے سکے ہم تو راہ جنوں کے مسافر ہیں زارا نہ جانے کب اس راہ میں ہی بکھر کر ختم ہو جائیں تم سوچتی ہوگی زارا کہ تم نے یہ کیسے شخص سے ناتا جوڑ لیا جو تمہیں چند دن کی بھی خوشی نہ دے سکا۔"

اور تب زارا نے بے حد ناراضگی سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھوں سے چھڑا لیا تھا۔

"اگر آپ کو اپنی بات یاد ہے تو میرا جواب بھی یاد ہوگا۔ اس راہ جنوں پہ تنہا آپ کو ہی چلنے کا فخر حاصل نہیں ہے سید ثقلین شاہ بلکہ مجھے بھی یہ فخر ہے کہ مطلب حسنین شاہ اور عابد شاہ کے علاوہ بابا جان اور اماں جان کی زندگیاں بھی اسی راہ جنوں میں قربان ہوئیں اور خود مجھے بھی اس راستے کا مسافر بننے سے کوئی نہ روک سکتا تھا اگر مجھے آقا جان اور اماں جان کی تنہائی کا خیال نہ ہوتا۔

اور اس کے غصے اور ناراضگی سے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ کر سید ثقلین شاہ بے اختیار ہنس دیے۔

"بخدا زارا شاہ اس وقت آپ بے حد خوبصورت لگ [illegible] رہی ہیں [illegible] فخر ہے زارا شاہ کی پلکیں ان کی نظروں کی تپش سے جھک گئی تھیں اور گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے وہ بہت محبت اور دلچسپی سے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھنے لگے تھے۔

اور پھر دو دن تو جیسے پنکھ لگا کر گزر گئے تھے۔ ان دو دنوں میں انہوں نے اماں جان آقا جان اور زارا سے بے انتہا باتیں کی تھیں حسنین شاہ کو بہت یاد کیا تھا اور زارا سے اس کے بچپن کی ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ کتنا ہی چاہ رہا تھا کہ اپنے ساتھ اس ماں جائے لاڈلے بھائی کی قبر پہ جا کر فاتحہ پڑھیں پھول چڑھائیں کہ جس کے جنازے کو نہ تو وہ کندھا دے پائے تھے اور نہ ہی قبر پہ مٹھی بھر خاک ڈال پائے تھے لیکن آقا جان نے انہیں سختی سے روک دیا تھا ڈیوڑھی کی کنڈی چڑھائے آقا جان لکڑی کے تخت پہ بیٹھے قرآن پڑھتے یا تسبیح پڑھتے رہتے تھے آس پاس کے گھروں کی کسی خاتون کے آنے پر بھی وہ سید ثقلین شاہ کو اندر بھیج دیتے تھے۔ وہ جھنجلاتے تو آقا جان مسکرا دیتے۔

"احتیاط اچھی چیز ہے ثقلین شاہ اور تم مجاہدوں کی زندگیاں تو بہت قیمتی ہیں۔"

اور اس شام جب وہ اندر بڑے کمرے میں اماں جان کی رضائی اوڑھے نیم دراز تھے

اور زارا شاہ انگیٹھی سامنے رکھے لوہے کی سلاخ سے اس میں کوئلوں کو کریدتی انہیں آسیہ آپا اور دختران کشمیر کی تحریک کے متعلق بتا رہی تھی تو انگیٹھی کے دہکتے کوئلوں کا عکس کبھی کبھی اس کے رخساروں پر پڑ کر لمحے بھر کو عجب دمک اور حسن عطا کر جاتا تھا اور وہ دھیان سے اس کی باتیں سنتے گاہے بگاہے اس کے چہرے پر بھی نظر ڈال لیتے تھے اور مسکراہٹ خود بخود ان کے لبوں پر بکھر جاتی تھی اور اماں جان قریب ہی دوسری چارپائی پر بیٹھی کچھ سی رہی تھیں کہ اچانک انہیں کمرے میں ایک انوکھی سی مہک محسوس ہوئی تھی ایسی مہک جس میں عنبر ولوبان کی خوشبو تھی۔ کچھ نرالی سی مہک یہ مہک تو انہوں نے عابد شاہ قیصرانی کے جسم سے پھوٹتی محسوس کی تھی اور یہ مہک تو حسنین شہید کے جسم سے آ رہی تھی تو کیا اس گھر میں ابھی تک حسنین کی مہک رچی ہے۔

یہ الوہی خوشبو جب سے وہ آئے تھے کئی بار انہوں نے محسوس کی تھی اور سوچا تھا جیسے حسنین کی روح کہیں آس پاس ہی ہے۔

اور وہ سامنے کارنس پر پڑی حسنین کی نوعمری کی وہ تصویر دیکھنے لگے تھے جو ایک بار عید کے موقع پر اس نے ضد کر کے اشرف فوٹوگرافر سے بنوائی تھی۔ وہ بے اختیار چارپائی سے اتر کر اس کی تصویر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اس تصویر میں وہ بارہ تیرہ سال کا تھا انہیں لگا جیسے اس کی [illegible] آنے پر وہ خوش ہوتا تو اس کی آنکھیں یونہی چمکتی تھیں جگر جگر [illegible] وہ تصویر کو دیکھ رہے تھے اور ان کے اردگرد پھیلی مہک انہیں اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔

"زارا"

وہ تصویر کے پاس سے ہٹ کر دوبارہ اماں کے پلنگ پر آ کر بیٹھے تو بے اختیار فرمائش کر بیٹھے۔

"زارا عابد شاہ قیصرانی کی ڈائری سے اس کی کچھ نظمیں تو سناؤ۔"

حسنین کی تصویر دیکھتے اور اس کی انوکھی سی مہک کو اپنے اندر اتارتے ہوئے انہیں اس سے عابد قیصرانی بھی بے تحاشا یاد آیا تھا اور جب زارا شاہ اٹھ کر اپنے کمرے سے ڈائری لینے گئی تو دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی' یہ دستک' وہ بے اختیار اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

یہ دستک کا مخصوص انداز تو سبطین کا تھا تب ہی باہر تخت پر دھوپ میں بیٹھے آقا جان نے فوراً ہی اٹھ کر کنڈی کھول دی تھی اور سبطین کو اندر بھیج کر کتنی ہی دیر دروازے کے پاس کھڑے ادھر ادھر کی سن گن لینے کے بعد مطمئن ہو کر دروازہ بند کر دیا تھا اور پھر یہ رات تو ماضی کی کئی پرانی یادوں کو تازہ کر گئی تھی۔ سبطین اماں جان اور آقا جان کے گلے لگ کر حسنین کو یاد کر کے رویا بھی تھا

اور اس کی شہادت پر فخر کا اظہار بھی کیا تھا۔ اماں جان اور آقا جان کو شہید کے والدین کے منصب پر فائز ہونے پر مبارکباد بھی دی تھی اور گھنٹوں اماں جان کی گود میں سر رکھے حسنین کے بچپن کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا رہا تھا۔ زارا شاہ کے ساتھ ہنسی مذاق بھی کیا تھا۔ سید ثقلین شاہ کے حوالے سے چھیڑا تھا اور بے تحاشا خوشی کا اظہار بھی کیا تھا اماں جان نے زارا کے ساتھ مل کر سبطین شاہ اور سید ثقلین شاہ کی پسند کا کھانا بنایا تھا اور پھر رات گئے تک وہ بڑے کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے اور جب نیند کے بوجھ سے پلکیں بوجھل ہو گئیں تو وہ زارا کے ساتھ اپنے کمرے میں جانے کے لیے نکلے تو ایک بار پھر اسی الوہی خوشبو نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا تھا اور وہ عجیب سے احساس میں گھرے اپنے کمرے میں آئے تھے۔

"کل رات کے کسی پہر مجھے جانا ہے زارا۔"

کمرے میں آ کر انہوں نے زارا کو بتایا تو ایک لمحے کو اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"تم دعا کرنا کہ ایسی بہت ساری راتیں اور دن ہمارا نصیب بنیں۔ جب صبح آزادی طلوع ہوگی نا زارا تو پھر میں ایک لمحے کو بھی تم سے جدا نہیں ہوں گا۔"

"انشاء اللہ وہ دن دور نہیں۔"

زارا نے مسکرا کر انہیں دیکھا تھا۔

"سبطین شاید ایک دو دن اور رہے۔ میں سبطین کی وجہ سے رکا ہوا تھا۔ کمانڈر مرتضیٰ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ سبطین کو عابد شاہ کی نظمیں ضرور سنانا۔"

زارا کا جی چاہا وہ آج کی رات پلک تک نہ جھپکے اور نہ ہی سید ثقلین شاہ سوئیں وہ ان کا ہاتھ تھامے اسی طرح نرم نرم میٹھے میٹھے لہجے میں باتیں کرتے رہیں اور رات بیت جائے لیکن وہ جانتی تھی کہ نہ جانے کتنی راتوں کی بے خوابی کے بعد وہ یہ دو تین دن پرسکون نیند سو رہے تھے وہ نہ جانے کتنی بے خواب راتیں نصیب میں لکھی تھیں۔

رات دیر سے سوئے تھے اس لیے فجر کے وقت جلد آنکھ نہ کھل سکی تھی۔ جب آقا جان مسجد سے نماز پڑھ کر آئے تو وہ ابھی تک فرض پڑھ رہے تھے۔ نماز پڑھ کر وہ باہر آقا جان کے پاس ہی آ کر بیٹھ گئے۔ آقا جان کے چہرے پر کچھ پریشانی تھی۔

"خیریت ہے آقا جان۔"

"ہاں سبطین کو کسی نے آتے ہوئے دیکھا تو نہیں تھا۔"

"سبطین نے ذکر تو نہیں کیا۔"

"میاں سبزی والا پوچھ رہا تھا کہ سبطین شاہ تو نہیں آئے ہوئے۔"

"میں نے کہہ دیا نہیں کہنے لگا کل سڑک پار کرتے ہوئے ایک شخص پر مجھے سبطین کا گمان ہوا تھا شاید غلطی لگی ہو دور تھا نا بہت۔"

"یہ کیسا آدمی ہے آقا جان۔"

"پتا نہیں...... آج تک تو اس کے متعلق کوئی ایسی ویسی رپورٹ نہیں ملی۔"

"تو پریشان نہ ہوں۔"

سید ثقلین نے انہیں تسلی دی تب ہی سبطین بھی باہر آ گیا تھا۔

"یہاں تو بہت خنکی ہے اندر ہی چل کر بیٹھتے ہیں آقا جان اٹھ کھڑے ہوئے۔"

اور سید سبطین نے کمرے میں آ کر انہیں بتایا کہ امیر مختار کے دادا اور دادی کو شہید کر دیا گیا تھا ان کے جانے کے چند دن بعد ایک زخمی مجاہد ان کے پاس ٹھہرا ہوا تھا کہ مجاہدین کو ڈھونڈتے ہوئے کچھ فوجی وہاں پہنچ گئے تھے اور انہوں نے پہلے تو دونوں پر بہت تشدد کیا اور پھر گولی مار کر جھونپڑے کو آگ لگا دی۔ کرنل نسیم نے جو دو دن قبل اچانک ہی اسے جنگل میں ملا تھا بتایا تھا۔

اور وہ بے طرح اداس ہو گئے تھے۔ بوڑھے دادا کے حوصلے کتنے جوان تھے اور وہ کتنی پامردی کے ساتھ مجاہدین کی خدمت کر رہے تھے اور اس روز سارا دن وہ بے کل اور بے چین سے رہے۔ زارا سے عابد شاہ کی نظمیں بھی سنیں۔ سبطین سے حالات حاضرہ پر بحث بھی کی اور زارا کو اجازت بھی دی کہ وہ جب چاہے آسیہ آپا اور دختران کشمیر کے ساتھ مل کر ملک کی آزادی کے لیے جو کرنا چاہے کر سکتی ہے آقا جان اور اماں جان بھی بے چین تھے۔ آقا جان تو تھوڑی تھوڑی دیر بعد ڈیوڑھی میں جا کر باہر جھانک آتے تھے لیکن خدا کا شکر ہے سب خیریت رہی تھی ان کا خوف بے معنی تھا رات کے پچھلے پہر جب وہ سب سے مل کر باہر نکلے تھے تو انہیں لگا تھا وہ انوکھی سی مہک جو گھر کے آنگن اور صحن میں پھیلی محسوس ہوتی تھی اور جو کبھی کبھی انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی ان کے ساتھ ہی تھی سبطین کا ارادہ فجر کے بعد کسی ٹائم جانے کا تھا۔ وہ اندھیری تنگ گلیوں اور ویران راستوں سے ہوتے ہوئے مجاہد رشید کے ٹھکانے پر آ گئے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ یہاں سے وہ اس وقت نکلیں گے جب زائرین کی آمد شروع ہو جائے گی۔ مجاہد رشید کا یہ ٹھکانہ حضرت بل کے نزدیک ہی تھا اور یہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی موجود رہتا تھا۔ رشید گہری نیند سو رہا تھا وہ مخصوص خفیہ راستے سے اندر آ کر زمین پر بچھی دری پر لیٹ گئے تھے لیکن نیند آنکھوں سے دور تھی آقا جان اماں جان، سبطین اور زارا کے چہرے نگاہوں کے سامنے آ رہے تھے۔ زارا کی آواز اور عابد شاہ کی نظم۔

اے آزادی کی دلہن
ہمیں تیری بہت چاہ ہے
اور ہم نے تیرے خیر مقدم کو
راستے لہو کے پھولوں سے سجا دیئے ہیں
تو کب ہمارے پھولوں کو عزت بخشے گی
اے آزادی کی دلہن
ہمیں تیری بہت چاہ ہے۔

وہ یونہی آنکھیں موندے لیٹے تو جانے کب پلک جھپک گئی اور انہوں نے حسنین کو دیکھا وہ ہنس رہا تھا کھلکھلا رہا تھا اور اس کے وجود سے وہی خوشبوئیں اور روشنیاں پھوٹتی تھیں

"حسنین میری جان۔"

وہ بازو پھیلائے اس کی طرف بڑھے ہی تھے کہ کسی نے بازو پکڑ کر انہیں جگایا۔ مجاہد رشید ان کے پاس کھڑا تھا اور کمرے میں سبز کشمیری چائے کی خوشبو پھیلی تھی۔

"آپ اٹھ کر نماز پڑھ لیں تو پھر چائے پی لی جائے۔"

اور وہ خاموشی سے اٹھ بیٹھے۔

مجاہد رشید نے ان سے کچھ نہیں پوچھا تھا کہ یہ تو [illegible] تھے اور سید ثقلین شاہ تو اکثر واپسی پر رات کے پچھلے پہر یونہی ادھر آ کر صبح کے وقت زیارت کر کے چلے جاتے تھے۔

وضو کرتے ہوئے انہیں لگا جیسے ان کے ارد گرد پھیلی خوشبو میں اضافہ ہوتا جا رہا ہو۔

تازہ خستہ باقر خانیاں اور چائے کا ناشتہ رشید نے ان کے سامنے رکھا تو ان کا کچھ بھی کھانے یا پینے کو جی نہ چاہا۔

"تھوڑی سی چائے تو لے لیں۔"

"نہیں جی نہیں چاہ رہا۔"

ابھی باہر ہلکا سا اندھیرا تھا وہ چاہتے تھے کہ لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو جائے تو وہ نکلیں اس وقت تو گشت کرنے والے یقیناً ان کا نوٹس لیتے۔ انہوں نے سوچا کچھ دیر قرآن کی تلاوت کر لیں۔ رشید نے برتن سمیٹے اور فرید چائے بنانے کے لیے مصروف ہو گیا وہ درگاہ کے نزدیک ہی کشمیری چائے بیچتا تھا۔ قرآن کی تلاوت کر کے انہوں نے کھڑکی سے جھانکا تو دیکھا سورج نکل آیا تھا اور سورج نکلنے کے ساتھ ہی زائرین کی آمد شروع ہو جاتی تھی۔

"میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔"

سید ثقلین شاہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں بھی ساتھ ہی نکلتا ہوں۔"

مجاہد رشید نے اپنا سماوار اور چائے کی پیالیاں اٹھائیں اور پھر جیسے کچھ یاد کر کے بولا۔

"ایک منٹ رکیں۔ یہ آب زم زم ہے ایک حاجی نے دیا تھا۔"

انہوں نے دعا مانگ کر آب زم زم کے دو تین گھونٹ بھر کر رشید کا شکریہ ادا کیا اور اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئے۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر تھے۔ ان کا ارادہ حضرت بل جانے کا نہیں تھا لیکن انہیں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی سے بے حد عقیدت تھی سو وہ اچانک ہی راستہ بدل کر حضرت بل کی طرف آ گئے، جانے کب آنا ہو پھر اور حضرت بل کے باہر گشت کرتے سپاہیوں سے باتیں کرتے میجر بلونت کی نظر اچانک ہی ان پر پڑی تھی اور انہیں پہچاننے میں اسے ایک لمحہ بھی نہیں لگا تھا ایک مقامی کالج میں پڑھنے کے بعد پچھلے ماہ ہی اس نے انہیں دیکھا تھا۔ اسلحے کے ڈپو کی خوفناک تباہی سے وہ ابھی تک بلبلا رہا تھا گو اس نے خود انہیں دیکھا تھا اور نہ ہی دیکھتا تو سب کہہ رہے تھے کہ یہ کمانڈر مرتضیٰ اور سید ثقلین شاہ کا کارنامہ ہے۔ وہ نہ جانے کس دھیان میں تھے کہ ان کی نظر میجر بلونت [illegible] پڑی تھی۔ میجر بلونت نے چیتے کی سی پھرتی سے پہلو میں لٹکا [illegible] نکالا اور [illegible] گولیاں ان کے سینے میں اتر گئی تھیں وہ لڑکھڑائے اور پھر گر گئے میجر بلونت نے آگے بڑھ کر ان کے چہرے پر بوٹ سے ٹھوکر ماری اور اونچا وحشیانہ قہقہہ لگایا انہوں نے آنکھوں کو کھولا اور بند کیا۔ سامنے حسنین شاہ اور ان کا ہاتھ تھامے عابد شاہ قیصرانی کھڑے مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ الوہی اور انوکھی مہک لیے خوشبوؤں نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا تھا انہوں نے بلند آواز میں کلمہ پڑھا ان کی آواز اتنی بلند تھی کہ دور سماوار اٹھائے ساکت کھڑے رشید کے کانوں میں آئی تو اس کے لبوں سے بے اختیار

"اناللہ وانا الیہ راجعون"

نکلا اور وہ سماوار وہیں رکھ کر دو قدم آگے بڑھا اور پھر رک گیا بلونت سنگھ یکدم دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا اور انہوں نے مندی آنکھوں سے اسے پیچھے ہٹتے دیکھا تو ان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی کانوں میں زارا شاہ کی آواز آئی۔

ہم دیوانے ہیں
اور آزادی کی دیوی

دیوانوں کے قدموں پر ہی جھکتی ہے
یہ راہ جنوں ہے
لیکن اسی راہ پر چل کر
بالآخر دیوانوں کو وصل نصیب ہوگا
اے آزادی کی دیوی
ہم تجھے نہ پا سکے لیکن ہمارے بعد آنے والے
اسی راہ کے مسافر
تجھے ایک روز ضرور پالیں گے۔

ان کی آنکھیں ہولے ہولے بند ہو رہی تھیں اور لبوں پر مدھم آواز میں کلمۂ شہادت جاری تھا۔ ان کی آنکھیں بند ہوئیں تو بلونت سنگھ نے قہقہہ لگایا اور آگے بڑھ کر ایک ٹھوکر لگائی۔ مجاہد رشید اپنی جگہ کھڑے کھڑے لرز گیا۔

''آج رات میں شاندار جشن مناؤں گا۔''

وہ موبائل نکال کر کسی کو سید ثقلین شاہ کی شہادت کی خبر دینے لگا تو ڈھیرے ڈھیرے لوگ ان کے اردگرد اکٹھے ہونے لگے جن میں مجاہد رشید بھی تھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ہجوم میں موجود ایک شخص کو اشارہ کیا جو ہجوم میں راستہ بناتا تیزی سے شہید کمانڈر کی طرف بڑھ رہا تھا تاکہ ان کی میت ان کے گھر پہنچا سکے اور مجاہد رشید کی آنکھوں میں نمی تھی اور لبوں پر دعا تھی۔

''یارب العالمین ہمارے شہیدوں کے خون کو قبول فرما!
اور ہمیں آزادی عطا فرما۔
یہ ظلم و ستم کب تک میرے مولا کب تک۔
اب تو صبح آزادی کا سورج طلوع کر میرے مولا۔''

اور دعائیں مانگتے مانگتے وہ سید ثقلین شاہ کے پاس پہنچ کر دوزانو بیٹھ گیا اور اسے لگا جیسے سید ثقلین شاہ کی مسکراہٹ کہہ رہی ہو۔

آزادی کا سورج ضرور طلوع ہوگا مجاہد رشید انشاءاللہ۔

انشاءاللہ۔

اس نے زیر لب کہا اور ان کی روشن پیشانی چومنے کے لیے ان کے ماتھے پر جھک گیا۔

☆ ☆ ☆